بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

القرآن

منکرات کی تعلیم دینے والے

منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک طرح کے ہیں، بری بات کی تعلیم دیتے ہیں اور اچھی بات سے منع کرتے ہیں اور اپنے ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں۔ انہوں نے خدا کا خیال نہ کیا پس خدا نے ان کا خیال نہ کیا، بلاشبہ یہ منافق بڑے ہی سرکش ہیں۔

{سورۂ توبہ۔ آیت 67}

الحدیث

اللہ سے ڈرو اور نہی عن المنکر کرتے رہو!

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''عنقریب تمہارے لئے دنیا کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور یوں تمہارا امتحان لیا جائے گا تم میں سے جو شخص یہ زمانہ پائے تو اللہ سے ڈرے اور امر بالمعروف اور نہی المنکر کرتا رہے اور رشتہ داروں اور قرابت داروں سے اچھا سلوک کرے۔

{رواہ احمد}

مولانا مفتی محمد ابراہیم صادق آبادی

میت کے منہ سے نکلنے والی رال:

سوال: میت کے منہ سے نکلنے والی رال پاک ہے یا ناپاک؟ غسل میت سے پہلے نکلنے والی رال اور غسل کے بعد نکلنے والی رال دونوں کا حکم الگ الگ بتا دیجیے۔ (س۔ بہاول پور)

جواب: میت کے منہ سے خارج ہونے والی رال نجس ہے۔ (ردالمحتار ۱/۱۳۸)

کسی کے جسم یا کپڑے پر لگ جائے تو دھونا ضروری ہے، غسل میت سے پہلے یا بعد خارج ہونے والی رال کا ایک ہی حکم ہے، البتہ غسل کے بعد نجاست خارج ہونے کی صورت میں غسل پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔ نجاست والی جگہ کو دھو کر صاف کر دیا جائے، غسل دوبارہ دینے کی ضرورت نہیں۔

کموڈ استعمال کرنے کا حکم:

سوال: دورانِ سفر عموماً ایسا ہوتا ہے کہ بڑے شہروں میں سادہ بیت الخلا نہیں ہوتے، انگریزی بیت الخلا یعنی کموڈ ہوتے ہیں، کیا ان کا استعمال جائز ہے؟ جبکہ ان کو استعمال کرنے کی صورت میں بدن اور کپڑوں کی پاکی کا اطمینان نہیں ہوتا۔ (اہلیہ کمال الدین۔ لاہور)

جواب: اول تو کوشش کی جائے کہ کموڈ استعمال نہ کرنا پڑے، اگر جستجو کے باوجود کہیں سادہ بیت الخلا نظر نہ آئے تو بامر مجبوری کموڈ کا استعمال جائز ہے۔ اگر اس کی پاکی کا اطمینان نہ ہو تو اس پر بیٹھنے سے پہلے پانی بہادیں تاکہ کموڈ کا اوپری حصہ پاک ہو جائے، پھر احتیاط سے بیٹھ کر فارغ ہوں۔ احتیاط کے باوجود اگر نجاست لگ جائے تو اٹھنے کے بعد اسے دھو کر جسم پاک کر لیں۔

بیوی کے اصول وفروع کو زکوٰۃ دینے کا حکم:

سوال: میری بیٹی کو اس کے خاوند نے زکوٰۃ کی رقم دی کہ مستحقین میں تقسیم کر دے۔ سوال یہ ہے کہ بیٹی یہ رقم مجھے دے سکتی ہے؟ یا اپنے بچوں کو (جو سابق خاوند کی اولاد ہے) دے سکتی ہے؟ (س۔ صادق آباد)

جواب: اگر آپ مستحق زکوٰۃ ہیں تو بیٹی زکوٰۃ کی رقم آپ کو دے سکتی ہے۔ اسی طرح اس کے بچے (خواہ بالغ ہوں یا نابالغ) اگر مستحق ہیں تو ان کو بھی دے سکتی ہے۔

بخیل کا کھانا بیماری ہے، سخی کا کھانا شفا، یہ حدیث ہے؟

سوال: گزشتہ دنوں فیس بک پر ایک حدیث مشتہر کی گئی کہ ''بخیل کا کھانا بیماری ہے اور سخی کا کھانا شفا'' لوگوں میں اس کا بہت چرچا ہوا، اس حدیث کا حوالہ درکار ہے۔ (ع۔ صادق آباد)

جواب: یہ حدیث کے نام سے جھوٹ پھیلایا جا رہا ہے۔ پھیلانے والے مجرم ہیں اور اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہ، جن لوگوں نے نادانی میں حدیث سمجھ کر اس کی تشہیر کی ان پر فرض ہے کہ اس کی تردید کریں اور تردید کی بھی بھرپور تشہیر کریں اور ساتھ توبہ و استغفار کریں۔ محدثین کی تصریح کے مطابق یہ حدیث ثابت نہیں۔ امام شمس الدین سخاوی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

حدیث طعام البخیل داء و طعام الجواد دواء۔ الدارقطنی فی غرائب مالک والخطیب فی المؤتلف والدیلمی فی مسندہ من جهة الحاکم وابو علی الصدفی فی عوالیہ وابن عدی فی کاملہ من طریق احمد بن محمد بن شعیب السجزی عن محمد بن معمر البحرانی عن روح بن عبادۃ عن الثوری عن مالک عن نافع عن ابن عمر بہ مرفوعاً ولفظ الخطیب: طعام السخی دواء او قال شفاء وطعام الشحیح داء، ولفظ بعضهم طعام الکریم۔

قال شیخنا: وهو حدیث منکر وقال الذهبی: کذب وقال ابن عدی انہ باطل عن مالک فیہ مجاهیل وضعفاء ولا یثبت المقاصد الحسنة ۲۷۲۔ ومثلہ فی الکشف الالٰهی ۲/۴۶۴ والشذرة فی الاحادیث المشتهرة ۱/۳۷۳ وتمییز الطیب من الخبیث ۱۱۴ وکشف الخفاء ۲/۳۸ وتحذیر المسلمین ۱۴۲ والنخبة البهیة ۷۷ و اسنی المطالب ۱۹۱ وغیرها۔

ایک مکالمہ، ایک لطیفہ

آئینہ گفتار

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

رمضان المبارک میں بوقت افطار اہل خانہ کے ساتھ اوّل حدیث کی تعلیم، پھر جہری ذکر اور اخیر وقت دعا کا معمول رہتا ہے۔

دعا مانگتے ہوئے دو قرآنی دعاؤں کا ہمیشہ اہتمام رہتا ہے۔

ایک والدین کے لیے: ربِ ارحمھما کما ربینی صغیرا۔

اور دوسری بیوی بچوں کے لیے:

ربنا ھب لنا مِن ازواجنا و ذرِیتنا قرۃ اعین و اجعلنا لِلمتقِین اماما۔

اچھا جب ہم اجتماعی دعا کرواتے ہیں تو بیگم بچے زور زور سے آمین کہتے ہیں۔

ایک دن یہ دوسری والی دعا کرتے ہوئے یونہی اچانک خیال آ گیا کہ اس دعا میں اللہ میاں نے زوجہ (بیوی) نہیں ازواج (بیویاں) فرمایا ہے:

یعنی اے ہمارے رب! ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا!

بلند آہنگ یہ دعا مانگتے ہوئے اِس دل خوش کن خیال کا آنا تھا اور بیگم کا زور سے آمین کہنا تھا کہ بھئی سچ مچ لطف آ گیا، گویا پیاس سے سوکھتے منہ میں مٹھاس بھر آئی۔

بعد مغرب بیگم صاحبہ کو مسکراتے ہوئے یہ مفہوم بتایا اور کہا کہ اب تو بیگم! تم نے بھی آمین کہہ دیا، اب تو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک کا مزید سامان تمھیں ہی ڈھونڈنا ہے، قدرت کی چاہت بھی یہی لگتی ہے کہ آنکھیں جب دو ہیں تو ٹھنڈک بھی دو ہی سے حاصل ہو۔

اس موضوع پر ہمیشہ سے تیز اور حاضر جواب بیگم صاحبہ کو مگر اِس وقت کوئی جواب نہ بن پڑا، جبکہ جواب تو بالکل ''واضح'' تھا۔

اگلے دن افطار میں یہ دعا کرتے ہوئے ہماری بتیسی نکلتی تھی تو بیگم کی پھنسی پھنسی آمین۔ وہ بھی شاید اِس لیے کہ وہ ایک ماں بھی تو تھیں، بچوں کی بھلائی مانگی جائے تو وہ بھلا کیسے منہ سی لیں؟

لیکن اُس دن بعد مغرب انھیں ایک الزامی جواب سوجھ ہی گیا، چہک کر بولیں:

''جی نہیں، یہ کوئی لازم نہیں ہے، ورنہ قرآن تو ہم عورتیں بھی پڑھتی ہیں اور یہی دعا ہمارے مانگنے کے لیے بھی ہے تو ہم عورتوں کے لیے اِس دعا کا پھر کیا مطلب ہوا؟''

یہ فرما کر انھوں نے ہمیں فاتحانہ نگاہوں سے دیکھا۔

ہم لاجواب تو ہوئے، مگر حسبِ عادت اپنی بات اوپر رکھنا چاہی:

''نہیں تم لوگ تو اپنے مومن بھائیوں کی دعا کو نقل کر رہی ہوتی ہو ناں بس۔''

ترنت جواب آیا:

''تو اللہ میاں بھی مومنین کی ایک اجتماعی دعا نقل فرما رہے ہیں بس۔''

مری مری آواز میں اِس وقت تو ہم نے بس اتنا ہی کہا:

''بیگم! زیادہ سنجیدہ کیوں ہوتی ہو، ازواج سے یہ استخراج تو بس تمھیں چھیڑنے واسطے تھا......!''

جی ہاں قارئین! یہاں ایک مرد کی متعدد بیویاں ہی اصل مراد نہیں، بلکہ یہاں جمع کی نسبت جمع کی طرف ہے تو معنی ہوگا ہماری بیویوں کو، یعنی مومنین کی اجتماعی دعا۔

ویسے ازراہِ تفنن! ابھی خیال آیا کہ ہم نے ذرا جلدی کر دی۔ سارا رمضان بیگم کو خوب آمین کہلواتے، جب ان کی آمین قبول ہو کر صلہ مل جاتا تو ''صلے'' کو ساتھ لے جا کر انھیں کہتے کہ اِن سے ملو، یہ ہے تمھاری آمینوں کا صلہ......!

چلیں آج آپ بہنوں کو بہت بور کر لیا، سو چلتے چلتے موضوع کی مناسبت سے آپ کو ایک لطیفہ سناتے چلتے ہیں۔

ہوا یوں کہ ایک بار ایک عالمہ خواتین میں زور و شور سے مردوں کی ایک سے زائد شادیوں کے فضائل اور محاسن پر بلیغ و مدلل بیان فرما رہی تھیں۔

جب بیان ختم ہوا تو سامعین میں سے ایک خاتون جھجکتی ہوئی کھڑی ہوئیں اور سوال کیا:

''کیا آپ واقعی مردوں کی دوسری شادی کے حق میں ہیں؟''

''جی بالکل۔'' عالمہ بی بی نے جواب دیا۔

خاتون نے ایک گہرا سانس لیا، پھر کچھ لجاتے ہوئے بولیں:

''شکر ہے خدا کا، میں تو پہلے آپ سے بات کرتے ہوئے بہت ڈرتی تھی، دراصل میں آپ کے خاوند کی دوسری بیوی ہوں۔''

یہ سننا تھا کہ عالمہ بی بی غش کھا کر مسند سے گر پڑیں۔

اب اِس سے پہلے کہ قاریات بہنیں اِس ناچیز بھائی سے ناراض ہوں، ہم چلتے ہیں۔

والسلام مدیر مسئول محمد فیصل شہزاد

مدیرِ اعلیٰ: مفتی فیصل احمد
مدیر: انجینئر مولانا محمد افضل احمد خان
مدیرِ مسئول: محمد فیصل شہزاد

''خواتین کا اسلام'' دفتر روزنامہ اسلام ناظم آباد 4 کراچی فون: 021 36609983 ای میل: fayshah7@yahoo.com

انٹرنیٹ: www.dailyislam.pk سالانہ زرِ تعاون: اندرونِ ملک 1200 روپے، بیرونِ ملک ایک میگزین 18000 روپے، دو میگزین 20000 روپے

سوتیلی

اسماء شاکر عثمانی۔ امریکا

”کیا ہوا؟ ڈاکٹر کیا کہہ رہے ہیں۔“

”پتا نہیں کیسی مائیں ہوتی ہیں، ایک سال کی بچی کو پھینک کے چلی گئی!“

لوگ چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔

فاروق صاحب کی سب سے چھوٹی بہو اپنی ایک سال کی بچی اسپتال ہی میں چھوڑ کر کسی اور کے چکر میں بھاگ گئی تھی اور اب خلع کا مقدمہ کر دیا تھا۔

ہر خاص و عام کی زبان پر یہی داستان تھی۔

☆......☆

اور یہ داستان میری ہے۔ وہ ایک سال کی بچی میں ہوں۔ سنا ہے میری ماں بڑی خوب صورت تھی اور بدکار بھی تھی، تبھی تو اپنی عیاشیوں کی خاطر اپنی بیٹی کی بھی پروا نہیں کی۔

فاروق صاحب یعنی میرے دادا، میری دادی، میرے دو تایا اور دو پھوپیاں یہ میرا ددھیال تھا۔ شروع میں جب میں آئی یا پھینکی گئی تو میری دادی نے مجھے پالا۔ وہ بتاتی ہیں کہ میں بہت رونی صورت تھی۔ ہر وقت رونا میرا مشغلہ تھا۔ گھر میں دو تائی اور ان کے بچے بہت خوش حال زندگی گزار رہے تھے۔ پھوپیاں بھی شادی شدہ اپنے اپنے گھر میں خوش اور مطمئن تھیں۔

میرے دادا کے گھر پورے وقت کے لیے نوکرانی تھی۔ وہ میرے بچپن کے حالات بتاتی تھی کہ جب تیری ماں تجھے لینے آئی تھی تو بہت رو رہی تھی۔ کسی طرح تجھے چھوڑ ہی نہیں رہی تھی۔ تیرے دادا نے زبردستی چھینا تھا اس سے۔ انھیں

جب میں یہاں آئی تھی تو بھرے گھر میں مجھے کوئی اپنا نظر نہ آتا۔ میں کسی کے پاس نہ جاتی۔ دودھ پیتی نہ ہی سوتی۔ سب مجھے کوستے، برا بھلا کہتے، میری ماں کو گالیاں دیتے۔ دو دن میں ہی میری حالت غیر ہوگئی تو مجھے اسپتال ایڈمٹ کرایا گیا۔ یہ سب وہ نوکرانی ہی بتاتی تھی، کیوں کہ ظاہر ہے میں تو بچی تھی۔ خیر کسی نہ کسی طرح زندگی آگے بڑھنے لگی۔ میں بھوک سے بلبلا بلبلا کر جب تک روتی نہیں تھی کسی کو خیال نہیں آتا تھا کہ مجھے دودھ دے، اور جب میں بھوک سے تڑپ کر روتی تھی تو ایک دو ہاتھ جڑ کر مجھے فیڈر دی جاتی۔ میں تھوڑا بڑی ہوئی تو غسل خانے لے جانا، میری صفائی کا خیال رکھنا کسی کو یاد نہ رہتا اور جب کچھ ہو جاتا تو مجھے ایک دو ہاتھ مار کر نوکرانی پر غصہ اتارا جاتا کہ کتنی بڑی ہوگئی ہے، ذرا تمیز نہیں ہے، ٹوائلٹ جانا بتاتی نہیں۔

ایک دفعہ مجھے یاد ہے کہ تائی کی بیٹی صوفے سے گر گئی۔ میں وہاں قریب ہی کھڑی تھی۔ تائی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ مجھے کئی تھپڑ جڑ دیے اور دادی کو بتایا کہ میں نے صوفے سے گرایا ہے۔ دادا کمرے سے نکل کر آئے اور اتنی زور سے مجھے تھپڑ مارا کہ میں بلبلا اٹھی، جس پر تائی بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے نکل گئیں کہ منحوس ہر وقت روتی رہتی ہے۔

مجھے وہ دن بھی اچھی طرح یاد ہے جب ایک دفعہ سب لوگ پکنک پر گئے تھے۔ وہاں سب خوش تھے۔ گھومنے میں تفریح میں مصروف تھے۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی میں نے دادی سے کہا، تو انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے تائی سے کہا، دوسری تائی سے کہا کسی نے توجہ نہیں کی۔ پھپو سے کہا تو انھوں نے ڈانٹ دیا کہ چپ کر کے بیٹھو ابھی کھانا نکلے گا تو کھانا۔ باقی سب کے بچے سامان سے چیزیں نکال نکال کر کھا رہے تھے، جب کسی نے مجھے کچھ نہیں دیا تو میں نے بھی سامان سے کچھ نکالنا چاہا تو میری تائی نے دیکھ لیا اور ہاتھ کھینچ کر زور سے دھکا دیا کہ گندا ہاتھ ڈال دیا۔ سب کھانا خراب کر دیا۔ میں روتے ہوئے سب کو دیکھتی رہی کہ سب بچوں کی امیاں انھیں مسلسل کھانے کی چیزیں دے رہی تھیں، کاش میری بھی امی ہوتیں۔ ایک دن میرے تائی کی بیٹی کھلونے سے کھیل رہی تھی، میں اس کے پاس گئی اور اس کا کھلونا لینے لگی، جس پر وہ رونے لگی تو میری تائی نے مجھے اتنا مارا کہ میرے جسم پر نشان پڑ گئے۔

دادی کو کبھی کبھی مجھ پر ترس آ جاتا تھا، مگر دادا کو تو جیسے میری شکل دیکھ کر غصہ آ جاتا۔ ایک دفعہ میں اپنے دادا کے کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر میں میری تائی کی چھوٹی بیٹی بھی وہاں آگئی اور اس نے دادا کے بستر پر پیشاب کر دیا جس پر دادا نے مجھے ہی مارا اور اتنا مارا کہ میرے پیٹ سے خون رسنے لگا۔

اس دن پہلی دفعہ میرے ابو نے مجھے لپٹایا اور دادا سے پوچھا کہ آپ نے اسے کیوں مارا؟

دادا کا کہنا تھا کہ یہ آئی تھی میرے کمرے میں تو اسے دیکھ کر فرمان کی بیٹی آئی۔ یہی ہر فساد کا بیج ہے۔

اس دن ابو سے لپٹ کر میں پہلی دفعہ خوش ہوئی تھی۔ مجھ چھوٹی سی ناسمجھ بچی سے میری ماں کی وجہ سے سب نفرت کرتے تھے، جسے میں سمجھ نہیں پاتی تھی۔ دادی کبھی کبھی مجھے ٹافیاں دیتی تھیں تو میں اب ان کے پاس ہی رہتی، انھیں پانی دیتی، ان کے پیر دباتی، ان کے سر میں تیل لگاتی۔

ایک دن میں نے دیکھا کہ میری تائی کی بیٹیاں دادی کی ٹافیاں نکال کر کھا رہی ہیں۔

جب دادی نے پوچھا ٹافیاں کہاں گئیں تو سب نے میرا نام لے دیا کہ دادی اس نے کھائی ہیں۔ یہ چرا کر چھپ کر کھا رہی تھی، حالانکہ تائی اماں نے بھی دیکھا تھا کہ ٹافیاں ان کی بیٹیوں نے کھائی تھیں مگر وہ کچھ نہیں بولیں۔ دادی اماں نے مجھے ڈانٹنا شروع کر دیا۔ اسی وقت ابو آ گئے۔ ابو کو بھی جھوٹ بتایا گیا، جس پر ابو نے میرے گال پر اتنی زور سے طمانچہ مارا کہ انگلیوں کے نشان گال پر ابھر گئے۔ اس وقت تو میں رونا بھی بھول گئی تھی مگر ساری رات روتی رہی۔ یہ سب حالات اور واقعات گویا میری زندگی کا حصہ بن گئے تھے۔

پھر سنا میرے ابو کی شادی ہو رہی ہے۔ اس وقت

میری عمر چھے سال تھی۔

میں نے دادی سے پوچھا کہ شادی کیا ہوتی ہے؟

انھوں نے بتایا تمھاری امی آرہی ہیں۔

اف میری امی......! میں خوشی سے اس رات سو نہیں پائی۔ مجھے اپنی امی کے آنے کی بہت خوشی تھی۔ امی کے ساتھ میری ایک سال کی بہن بھی آئی تھی۔ ابو نے الگ گھر لے لیا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ اب میرا گھر یہ ہے۔ میں خوش تھی۔ امی نے چھوٹی بہن کے سارے کام میرے سپرد کردیے تھے جن کو میں خوشی سے پورے کرتی۔ نئے گھر آکر ابو بھی میرا خیال رکھنے لگے تھے۔ شروع شروع کے دنوں میں میری دادی، تائی، پھپھو اکثر گھر آتیں تو میری امی مجھے صاف ستھرے کپڑے دیتیں کہ جاؤ نہا کر پہن لو۔ اُس دن زبردستی میری پلیٹ میں کھانے کی چیزیں ڈال ڈال کر مجھے کھانے کو کہتیں۔ اس دن میں بہت خوش ہوتی۔

جب تھوڑے دن گزر گئے تو پھر کئی کئی دن ہوجاتے کوئی نہ آتا۔ میں بہر حال اپنی بہن کے ساتھ خوش تھی۔ ایک دن تایا آئے تو انھوں نے ابو پر غصہ کیا کہ ابھی تک اسکول میں ایڈمشن کیوں نہیں دلایا۔ اگلے دن ہی ابو مجھے اسکول لے گئے۔

اب میری زندگی میں کچھ خوشیاں آرہی تھیں۔ صبح اکثر امی کی طبیعت خراب ہوتی تو ابو آفس جاتے ہوئے کبھی مجھے دودھ دے دیتے کبھی کیلا کبھی بسکٹ۔ اسکول جانے سے پہلے یہ ہی میرا ناشتا ہوتا۔ راستے سے ایک چپس کی چھوٹی تھیلی دلا دیتے جسے میں وقفے میں کھاتی۔ اسکول سے واپسی پر کبھی کبھی امی دودھ کارن فلیکس دے دیتیں مگر اکثر اپنی چھوٹی بہن کو سنبھالنے کے چکر میں وہ پڑا رہ جاتا، اور پھر رات کو ہی کھانا ملتا۔ ایک دفعہ دادی گھر آئیں تو مجھے دیکھ کر پریشان ہوگئیں کہ میں بہت دبلی ہورہی ہوں پھر میرا کھانا پینا دیکھ کر ابو پر غصہ کیا کہ وہ سوتیلی ہے تو کیا ہوا تم تو سگے باپ ہو، تم کو خیال رکھنا چاہیے دیکھنا چاہیے۔ اس وقت پہلی بار میرے کان میں لفظ سوتیلی پڑا۔ میں سمجھ نہ پائی کہ سوتیلی کیا ہوتا ہے......؟

میں جیسے جیسے بڑی ہورہی تھی گھر کے ایک ایک کر کے سارے کام میری ذمے داری بن رہے تھے۔ اکثر اسکول کا ہوم ورک بھی کرنے کا وقت نہیں ملتا تھا۔ اب تو میرے تین بہن بھائی ہوگئے تھے۔ چھوٹی بہن چار سال کی ہوئی تو اس کو بھی میرے اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ بہن مجھ سے محبت کرتی تھی، مجھے بھی اس سے بہت محبت تھی، مگر امی صرف بہن سے محبت کرتیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں اسے کبھی ٹافی کبھی جوس کبھی چپس دیتیں کہ بہن کو کھلا دو۔

ایک دن میں نے امی سے پوچھا میں بھی کھالوں؟ تو انھوں نے کہا، نہیں تم بڑی ہو وہ چھوٹی ہے اس کو کھلاؤ۔ اسکول جاتے وقت اسے ٹفن دیا جاتا، پیار کیا جاتا، میں کھڑی دیکھتی رہتی۔

پھر ایک دن دادی آئیں تو میں نے دادی سے پوچھا:

”دادی! امی بہن کو تو سب چیزیں دیتی ہیں، پیار کرتی ہیں، مجھے کیوں نہیں پیار کرتیں؟“ تو دادی نے پھر وہی بات کہی کہ وہ تمھاری سوتیلی امی ہیں۔
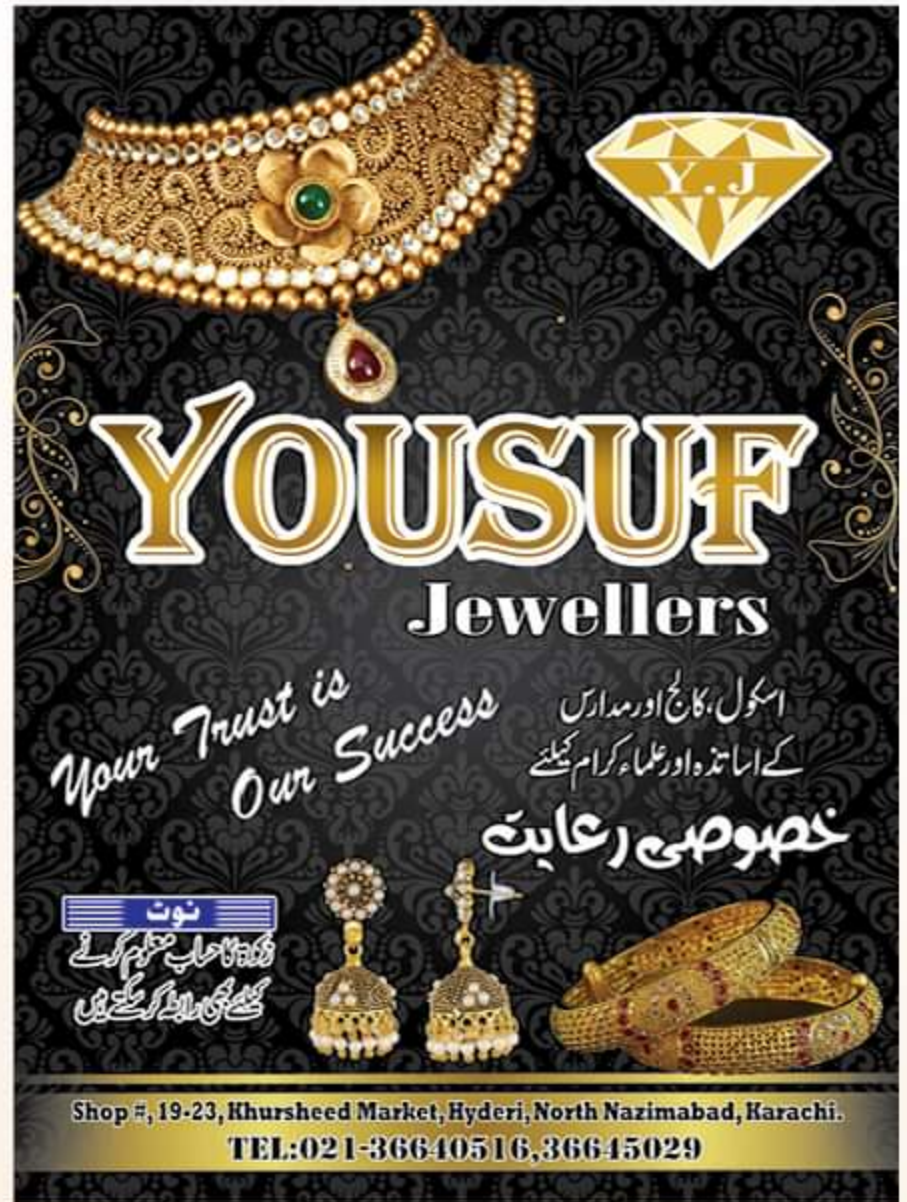
ایک دن گھر میں امی کی ایک پرانی سہیلی آئیں۔ میں معمول کے مطابق گھر کے کام اور بہن بھائی کو دیکھنے میں لگی تھی تو مجھے دیکھ کر کہنے لگیں:

”یار تمھاری یہ کام والی چھوکری تو بہت خوب صورت ہے۔ ایسی بچیاں بہت کام اچھا کرتی ہیں، کوئی اور ہو تو مجھے بھی بتانا۔ سارا دن رکھنے اٹھانے کے کام ہی بہت ہوتے ہیں، دروازہ بار بار کھولنا بچوں کو دیکھنا، یہ کم عمر ماسیاں بہت اچھا کرلیتی ہیں۔

میں نے امی کی طرف دیکھا تو حیران ہوئی کہ وہ ہنس کے چپ ہوگئی تھیں۔

پھر میں نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا تو واقعی میرا حلیہ ماسیوں والا ہی تو تھا۔ ایک ایک ہفتہ بلکہ بعض اوقات اس سے بھی زیادہ دن ہوجاتے، مجھے نہانے کا موقع نہیں ملتا۔ آج کل اسکولوں کی چھٹی تھی تو بال بھی کئی دن ہوجاتے کنگھا کیے ہوئے۔ کنگھا کرنے لگتی تو امی مجھے ڈانٹتیں کہ ہر وقت بناؤ سنگھار میں نہ لگی رہا کرو۔ میرے بال بہت جلدی لمبے ہوجاتے تھے۔ گھنے بھی بہت تھے۔ ایک دفعہ کنگھا کر رہی تھی تو جوں گری۔ بال پکڑ پکڑ کر مجھے مارنے لگیں کہ کتنی گندی ہو، صفائی کا خیال نہیں رکھتیں، پھر غصے میں انھوں نے میرے بال کاٹ دیے۔ میں چھپ چھپ کر خوب روئی کہ میری امی کیسی ہیں، سب سے پیار کرتی ہیں مگر مجھے پیار نہیں کرتیں۔

میں اپنی عمر سے زیادہ ہی بڑی لگنے لگی تھی۔ تیرہ سال کی عمر میں زندگی نے عجب رنگ دکھا دیے تھے۔ مجھے لوگوں کے سامنے تو بات نہیں کرنی آتی تھی مگر اکیلے میں خوب بولتی تھی۔

میرے اسکول میں ایک لڑکا تھا۔ ایک دن وہ میرے پاس آیا اور پوچھا تمھیں کیا دکھ ہے؟

میں حیران تھی کہ اس کو کیسے پتا چلا۔ وہ مجھ سے کافی دیر باتیں کرتا رہا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا تمھاری امی بھی سوتیلی ہیں؟ کہنے لگا نہیں، میری دو ممانیاں ہیں سوتیلی ماں کی طرح۔

پھر وہ اپنی کہانی سنانے لگا کہ اس کے ماں باپ میں بھی علیحدگی ہوگئی تھی۔ ماں مجھے لے کر نانا کے گھر آگئی۔ باپ کی دوسری شادی کی خبر سن کر ماں بیمار رہنے لگی اور ایک دن مر گئی۔ میں نو سال کا تھا تو نانی نے بہت پیار سے رکھا۔ نانا کا گھر تھا ماموں ممانی ساتھ ہی تھے، پھر پہلے نانا پھر نانی دونوں اللہ کو پیارے ہوگئے تو ممانیوں نے اپنا اصل چہرہ دکھانا شروع کیا۔

نانا نے مرنے سے کچھ پہلے مکان میرے نام کر دیا تھا۔ اس وجہ سے مجھے نکال نہیں سکتے تھے ورنہ شاید آج میں یتیم خانے میں ہوتا۔

نانا نے اپنے گھر کا ایک پورشن کرائے پر دے دیا تھا جس سے میری تعلیم کے خرچ پورے ہو رہے ہیں۔ ماموں برے نہیں ہیں مگر ممانیاں مجھے ماموں سے دور ہی رکھتی ہیں اور ماموں کی غیر موجودگی میں بہت برا رویہ رکھتی ہیں۔

وہ زیادہ تر گھر سے باہر ہی وقت گزارتا تھا۔ اس کے حالات مجھ سے ملتے جلتے تھے۔ وہ مجھے اپنی بہن کہتا تھا کہ مجھے بہنیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ وہ مجھ سے عمر میں دو سال بڑا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ مجھے تم بھائی کہا کرو۔ بھائی میرا خیال رکھتا۔ اسکول میں کسی لڑکی سے بات کرتی تو سب سے پہلے سوال کرتی تمھاری امی سوتیلی ہیں؟

لڑکیوں نے اس بات پر میرا مذاق بنانا شروع کر دیا۔ میرا نام سوتیلی امی رکھ دیا گیا۔ لڑکیاں سوتیلی امی کہہ کہہ کر ہنستیں۔ ایک دن کلاس میں جب ٹیچر پڑھا رہی تھیں تو انھوں نے مجھ سے کوئی سوال کیا۔ میں نے سنا ہی نہیں، وہ میرے پاس آئیں تو دیکھا میں نے پورے صفحے پر بس ماں ماں ہی لکھا ہوا تھا۔ وہ کاپی لے کر چلی گئیں۔ اگلے دن امی ابو کو اسکول بلایا گیا۔ میں بھی ساتھ تھی۔ پرنسپل نے کاپی امی ابو کو دکھائی اور پوچھا یہ کیا ہے؟ ابو تو ہمیشہ کی طرح خاموش رہے، امی نے کہا آپ اس سے ہی پوچھیں۔

میں کیا بولتی کیا بتاتی، بس میرے آنسو گرنے لگے، پھر میں بہت روئی، اتنا کہ میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ پرنسپل نے بڑھ کر مجھے لپٹا لیا، مجھ سے پوچھا یہ آپ کی امی ہیں تو پھر آپ کیوں رو رہی ہیں۔

اُس وقت مجھے پتا نہیں کیا ہوا، میں چیخنے لگی:

”نہیں نہیں یہ میری امی نہیں سوتیلی امی ہیں۔“

میری حالت دیکھ کر ابو سخت پریشان ہوئے۔ گھر آکر امی نے ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ مجھے بدنام کرتی ہے۔ میں اپنی بچیوں کی طرح خیال کرتی ہوں اور یہ مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ اب میں اس کو برداشت نہیں کر سکتی، بھیجیں اس کی ماں کے پاس!

ان کا یہ جملہ میرے دماغ میں گھس گیا۔ اب میری سوچ میں تبدیلی آنے لگی۔ ماں کو یاد کر کے روتی تو روتی رہتی۔ امی اسٹور میں بند کر دیتی کہ رو جتنا دل چاہے، میں دیر تک روتی ماں ماں پکارتی۔ میں کسی ماں کو اپنے بچے سے یا کسی بچے کو اپنی ماں سے لاڈ پیار کرتے دیکھتی تو میرے اندر سے امی امی کی آواز آنے لگتی اور مجھے خود پر قابو نہ رہتا۔

ابو دادی میری وجہ سے پریشان رہتے مگر کر کچھ نہیں سکتے تھے۔ اُدھر میرا اسکول میں بنا بھائی بھی زیادتیوں سے گھبرا کر آوارا گردی میں پڑ گیا۔ پڑھائی سے اس کا دل اچاٹ ہوگیا تھا۔

ایک دن ایک موبائل لایا کہ یہ تمھارے لیے ہے۔ میں نے پوچھا یہ تو بہت قیمتی ہے، تم کو کس نے دیا؟ تو کہنے لگا، میرے دوست کہتے ہیں جب حق نہ ملے تو چھین لو تو بس اب انھوں نے مجھے چھیننا سکھا دیا۔ یہ پہلا موبائل چھینا ہے جو میری بہن کے لیے ہے۔ پھر وہ مجھے موبائل چلانا سکھانے لگا۔

میرے ساتھ ابو نے (شاید اپنے بھائیوں اور والدہ کے ڈر سے) پڑھائی کے معاملے میں اچھا معاملہ کیا۔ شہر کے مہنگے اسکولوں میں پڑھوایا۔ چند دن میں، میں موبائل کے بارے میں سب سیکھ گئی۔ اب جب زیادہ طبیعت پریشان ہوتی میں بھائی سے بات کر لیتی۔ بھائی کئی دن سے اسکول نہیں آرہا تھا۔ اس کے میٹرک کے پیپر نزدیک تھے۔ پھر ایک دن پتا چلا کہ بھائی اور اس کے دوست پکڑے گئے اور تھانے میں ہیں۔ میں بہت پریشان ہوئی مگر بھائی کی کوئی خیر خبر نہیں مل رہی تھی۔ میں اکثر فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کرتی مگر ناکامی ہوتی۔ میٹرک کے پیپر ختم ہوگئے مگر بھائی کا کہیں پتا نہیں چل رہا تھا۔ میری پریشانی میرا دکھ ایسا تھا کہ کس سے کہتی، کس سے پوچھتی۔ کئی مہینے بعد بھائی سے رابطہ ہوا تو پتا چلا کہ وہ بہت غلط صحبت میں پڑ گیا ہے۔ اس کی عمر ہی کیا تھی شاید سولہ برس۔ ماموں ممانیوں نے پیسے دینا بھی بند کر دیے تھے۔ اب وہ کل کا ڈرا سہا لڑکا باقاعدہ لوٹ مار پر اتر آیا تھا۔ پولیس کئی بار جیل میں بند کرتی تو ان کے گروہ کے بڑے نکلوا لیتے۔ اسکول بھی ختم ہوگیا تھا۔ میری بہت بہت دن بات نہیں ہوتی۔ میں اپنے

آج کل!

نیٹ میں موبائل میں ہی مشغولیت ہے آج کل
کیا بتاؤں کس قدر مصروفیت ہے آج کل

رحمتوں سے دوریاں خود مولتے ہیں مومنیں
خندزن ابلیس کی مردودیت ہے آج کل

کب ادیبوں شاعروں کو جانتی ہے نسلِ نو
میڈیا پرسنس کی مقبولیت ہے آج کل

سچ بتاؤں اس نے خود روباہیت دکھلائی ہے
شیر کا مقسوم جو محکومیت ہے آج کل

پھر سما سے کیوں نہ نازل ہوں غضب کے فیصلے
ارض پر مغضوب کی محبوبیت ہے آج کل

عشق والے تو جنوں کے فیض سے محفوظ ہیں
عقل والوں ہی میں نامعقولیت ہے آج کل

جیسے اُن جیسا کوئی مقہور دنیا میں نہیں
ظالموں کے رخ پہ یوں مظلومیت ہے آج کل

پرسوں میرے خواب میں اقبال آئے تھے اثرؔ
یوں طبیعت میں بھی کچھ موزنیت ہے آج کل

اثر جونپوری

بھائی کی سلامتی کے لیے دعا کرتی۔

ایک دن صبح سے دل پریشان تھا۔صبح سے کئی دفعہ بھائی کو فون کیا مگر نا کام رہی۔ اگلے دن اسکول میں جاتے ہی جو خبر سب سے پہلے ملی وہ یہ تھی کہ بھائی کو ڈکیتی کرتے ہوئے پکڑلیا گیا ہے اور پولیس مقابلے میں اسے کئی گولیاں لگی ہیں۔ کچھ طلبہ کہہ رہے تھے کہ وہ مارا گیا ہے۔اس دن اسکول میں بھی جلدی چھٹی ہوگئی تھی۔ صرف چھ سات مہینے پہلے وہ ایک فرماں بردار، نیک اور ذہین پوزیشن ہولڈر طالب علم تھا،سب کو پتا تھا کہ اس کی ماں مرچکی ہے، باپ نے دوسری شادی کرلی وغیرہ اور آج اس کے مرنے کی خبر پہنچی تھی۔

میں گھر پہنچی تو میرا رونا بند نہیں ہو رہا تھا۔ بھائی بھائی کہہ کر میری چیخیں نکل رہی تھیں۔میری امی نے ابو کو پتا نہیں کیا کیا پٹی پڑھائی کہ پتا نہیں کس لڑکے کے چکر میں تھی۔ اس کی عمر دیکھو اور کرتوت دیکھو۔ اب وہ لڑکا کون تھا کیا تھا۔ابو میری حالت دیکھ کر تھوڑا پریشان ہوگئے۔ میں زندگی میں پہلی دفعہ ابو سے لپٹ گئی۔ روتے روتے میری حالت غیر ہو رہی تھی۔ابو نے بھائی کے متعلق پوچھا تو میں نے سب بتا دیا۔ پھر ابو نے ٹی وی کی خبروں میں بھی دیکھا کہ ۱۵ سے ۱۶ سال کے لڑکے ڈکیتی کے دوران پولیس مقابلے میں ہلاک ہو گئے۔تقریباً سب لڑکے ہی دنیا کے ستائے ہوئے یا رشتوں کی عدم توجہی کے شکار تھے۔اس دن میں نے ابو کی آنکھوں میں پہلی بار نمی دیکھی۔

بھائی کی موت کے بعد میرا کسی کام کسی چیز میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ امی کام کا کہتیں تو مجھ سے کام بگڑ جاتا، کبھی ہاتھ سے برتن ٹوٹ جاتے۔ میں امی کے کسی کام کی نہیں رہی تو ان کو میرا وجود بھاری لگنے لگا۔ دادی کا بھی انتقال ہوگیا تھا۔سو جو وہ ایک ذرا سی محبت کہیں سے ملتی تھی تو وہ راستہ بھی بند ہوگیا۔ میرا رونا بڑھتا جا رہا تھا۔ اب حالت ایسی ہوتی کہ روتے روتے بے ہوش ہو جاتی۔ ابو کے دل میں پتا نہیں اللہ کا خوف کہیں یا میرے لیے کوئی محبت کی چنگاری لگ گئی کہ ابو نے میری سگی ماں کے متعلق معلومات کرکے انھیں پیغام بھجوایا کہ تمھاری بیٹی جوان ہو رہی ہے۔ اب اسے تمھاری ضرورت ہے، اسے آکر لے جاؤ۔

وہ دن جب مجھے یہ پتا چلا کہ میری اپنی ماں مجھے لینے آرہی ہے تو میری وہ کیفیت زندگی میں پہلی بار ہوئی کہ مجھے پتا چلا کہ شاید خوشی اسی کو کہتے ہیں۔ وہ دن میری زندگی میں پہلی عید بن کر آیا تھا۔شاید میری زندگی کا ایک دردناک باب ختم ہونے جا رہا تھا، اور ابھی میں سولہ سال کی پوری نہیں ہوئی تھی۔

میرے ماموں پوری گاڑی سجا کر مجھے لینے آئے۔ ساتھ میں میری خالائیں بھی تھیں۔ماں اور نانی تایا سب گھر پر تھے۔ میں ابو بہنوں سے مل کر گاڑی میں بیٹھی اور گھر پہنچی تو دیکھا پوری گلی سجی ہوئی ہے۔ محلے والے گھر سے نکل نکل کر مجھ سے مل رہے تھے۔ پورا گھر سجایا گیا تھا بعد میں پتا چلا یہ نانا، نانی کا گھر ہے۔ امی کا گھر کہیں اور ہے۔ تین دن خوب خوشیاں منائی گئیں۔ خاندان اور محلے کے لوگ ملنے آتے رہتے، جو آتا اتنی محبت پیار سے ملتا کہ مجھے لگتا جیسے سب خواب ہے۔ میری نانی دن بھر مجھے خود سے لپٹائے رکھتیں، آتے جاتے پیار کرتیں۔ میری خالائیں مجھ پر فدا ہو رہی تھیں۔ ممانیاں بھی بہت اچھی تھیں۔

تیسرے دن ایک شخص آیا۔ امی نے بتایا کہ آج ہم اپنے گھر جائیں گے۔

میں نے اس شخص کے بارے میں پوچھا کہ یہ کون ہے؟

''یہ تمھارے بابا ہیں۔''

میں چکراتے چکراتے بچی، یعنی یہاں سوتیلا باپ۔ انھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا یہ اتنی سوکھی کیوں ہے؟ باپ کے پاس کھلانے کو کچھ نہیں تھا کیا؟'' اس وقت امی کے چہرے کا خوف مجھ سے چھپا نہ رہا۔

مجھے معلوم ہوا تھا کہ میرے ابو سے خلع لینے کے کئی سال بعد تک وہ ایسے ہی روتی رہی تھیں، پھر سب نے زبردستی اُن کی دوسری شادی کروا دی تھی۔

میرے اپنے ابو تو بہت پیسے والے تھے۔ مجھے اچھے اسکول میں پڑھایا تھا۔ میں سائنس میں میٹرک A+ گریڈ میں کرکے آئی تھی، مگر یہاں بابا نے ماں کو کہا کہ پرائیویٹ امتحان دلوا دینا، لڑکیوں کا کالج جانا صحیح نہیں۔ ماں بے بسی سے دیکھتی رہی۔

ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ مجھے یہاں کے تمام حالات پتا چلتے گئے۔ میرے سوتیلے والد ذرا ذرا سی بات پر امی کو مارتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ذلیل کرتے اور چیزیں کھینچ کر مارتے۔ ایسی ایسی گالیاں دیتے کہ میں نے زندگی میں کبھی ایسی باتیں نہیں سنی تھیں۔ مجھے بات بات پر طعنے دیتے کہ سگے باپ نے نکال دیا، یہ تو میں ہوں جو کھلا رہا ہوں۔ ایک پنسل بھی لا کر دیتے تو دس دس احسان جتاتے۔ میری ہر بات، ہر چیز پر انھیں اعتراض ہوتا۔(باقی صفحہ 10 پر)

چمنِ خیال

دعا کرو کہ یہ پودا سدا ہرا ہی لگے
اداسیوں میں بھی چہرہ، کھلا کھلا ہی لگے
نہیں ہے میرے مقدر میں روشنی نہ سہی
یہ کھڑکی کھولو ذرا، صبح کی ہوا ہی لگے
(شبیر بدر)

سورج ہوں، زندگی کی رمق چھوڑ جاؤں گا
میں ڈوب بھی گیا تو، شفق چھوڑ جاؤں گا
(اقبال ساجد)

میرا کارنامۂ زندگی، میری حسرتوں کے سوا کچھ نہیں
یہ کیا نہیں' وہ ہوا نہیں، یہ ملا نہیں، وہ رہا نہیں
(حسرت موہانی)

شاید کسی طوفان کی آمد کا ہے امکان
خشک درختوں میں ہیں سہمے ہوئے پتے
(ذکی عثمانی)

خزاں کی دھوپ سے شکوہ فضول ہے محسن
میں یوں بھی پھول تھا، آخر مجھے بکھرنا تھا
(محسن نقوی)

ہم سایہ دار پیڑ، زمانے کے کام آئے
جب سوکھنے لگے تو، جلانے کے کام آئے
(منور رانا)

ایک پتھر ادھر آیا ہے، تو اس سوچ میں ہوں
میری اس شہر میں، کس کس سے شناسائی ہے؟
(رضی اختر شوق)

(انتخاب: اقراء فرید، پنڈ گھیب، ضلع اٹک)

بدگمانی

عربی سے ترجمہ: محمد سلیم - چین

اِس خاتون سے ہوائی اڈے پر جہاز کے انتظار میں وقت ہی نہیں کٹ پا رہا تھا۔ کچھ سوچ کر دکان سے جا کر وقت گزاری کے لیے ایک کتاب اور کھانے کے لیے بسکٹ کا ڈبہ خریدا اور واپس انتظار گاہ میں جا کر کتاب پڑھنا شروع کی۔

اس عورت کے ساتھ ہی دوسری کرسی پر ایک اور مسافر بیٹھا کسی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ ان دونوں کے درمیان میں لگی میز پر رکھے بسکٹ کے ڈبے سے جب خاتون نے بسکٹ اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اسے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ اِس ساتھ بیٹھے مسافر نے بھی اس ڈبے سے ایک بسکٹ اٹھا لیا تھا۔

خاتون کا غصے کے مارے برا حال ہو رہا تھا، اس کا بس نہیں چل رہا تھا، ورنہ تو وہ اس کے منہ پر اس بے ذوقی اور بے ادبی کے لیے تھپڑ تک مارنے کا سوچ رہی تھی۔

اس کی حیرت اس وقت دو چند ہو گئی، جب اس نے دیکھا کہ جیسے ہی وہ ڈبے سے ایک بسکٹ اٹھاتی وہ مسافر بھی ایک بسکٹ اٹھا لیتا۔

غصے سے بے حال وہ اپنی جھنجھلاہٹ پر بمشکل قابو رکھ پا رہی تھی۔

جب ڈبے میں آخری بسکٹ آن بچا تو اب اس کے دل میں یہ بات جاننے کی شدید حسرت تھی کہ اب یہ بدتمیز اور بداخلاق شخص کیا کرے گا؟ کیا وہ اب بھی اس آخری بسکٹ کی طرف ہاتھ بڑھائے گا یا یہ آخری بسکٹ اس کے لیے رکھ چھوڑے گا؟

تاہم اس کی حیرت اپنے عروج پر جا پہنچی جب مسافر نے اس آخری بسکٹ کو دو حصوں میں تقسیم کر کے آدھا خود اٹھا لیا اور آدھا اس کے لیے چھوڑ دیا تھا۔

خاتون کے لیے اس سے بڑھ کر اہانت کی گنجائش نہیں رہتی تھی۔

آدھے بسکٹ کو وہیں ڈبے میں چھوڑ کر، کتاب کو بند کرتے ہوئے، اٹھ کر غصے سے پاؤں پٹختی امیگریشن سے ہوتی ہوئی جہاز کی طرف چل پڑی۔

جہاز میں کرسی پر بیٹھ کر اپنے دستی تھیلے کو اس میں سے عینک نکالنے کے لیے کھولا تو یہ دیکھ کر حیرت سے اس کی جان ہی نکل گئی کہ اس کا خریدا ہوا بسکٹ کا ڈبہ تو جوں کا توں تھیلے میں بند رکھا ہوا تھا......!

ندامت اور شرمندگی سے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ اسے اب پتا چل رہا تھا کہ وہ ہوائی اڈے پر بسکٹ اُس شخص کے ڈبے سے نکال کر کھاتی رہی تھی۔

اسے اب علم ہوا تھا کہ وہ شخص کس قدر مہذب اور رحمدل انسان تھا، جس نے کسی شکوے اور ہچکچاہٹ کے بغیر اپنے ڈبے سے اسے بسکٹ کھانے کو دیے تھے۔ وہ جس قدر اس موضوع پر سوچتی اسی قدر شرمندگی اور خجالت بڑھتی جا رہی تھی۔

اس شرمندگی اور خجالت کا اب مداوا کیا ہو سکتا تھا۔ اس کے پاس نہ تو اتنا وقت تھا کہ جا کر اس آدمی کو ڈھونڈے، اس سے معذرت کرے، اپنی بے ذوقی اور بے ادبی کی معافی مانگے، یا اس کی اعلیٰ قدری کا شکریہ ادا کرے۔

جی ہاں، چار باتیں ایسی ہیں جن کے بگاڑ کی اصلاح بعد میں نہیں ہو سکتی:

۱: کمان سے نکلا تیر۔
۲: زبان سے نکلے ہوئے الفاظ۔
۳: موقع ہاتھ سے نکل جانے کے بعد۔
۴: وقت گزر جانے کے بعد۔

☆☆☆

سامان

بنت شکیل اختر

☆ انسان کو جینے کے لیے بس اتنا سامان کافی ہے جو نبی پاک ﷺ اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے گھر تھا۔ زندگی تب بھی گزرتی تھی۔

☆ سامان کا ہونا عیب نہیں۔ ہمہ وقت سامان کو بڑھانے کی فکر اور سامان سے دیوانوں کی سی محبت غلط ہے۔

☆ سامان کی زیادتی کے باوجود اہمیت انسان کی ہو۔

☆ اہمیت انسان کا مطلب یہ نہیں کہ انسان کو سامان برباد کرنے کی اجازت ہو، بلکہ انسان کا دکھ سننے کا حوصلہ ہو۔

☆ غور طلب بات یہ ہے کہ حضور انور ﷺ نے غربت کو کیوں اختیار فرمایا؟

☆ لیکن آج غریب اپنی غربت پر شرمندہ ہے اس سے نالاں اور اپنی قسمت سے شاکی ہے۔

اس کے نزدیک عزت اور ترقی کا معیار صرف دولت ہے۔

☆ غریب امیروں کو برا بھلا بھی کہتا ہے، ان جیسا ہونا بھی چاہتا ہے اور جب ان جیسا نہیں ہو پاتا تو پھر برا بھلا کہتا ہے۔

☆ عزت، ترقی کا معیار صرف دولت ہے تو پھر فرعون، شداد اور قارون کو عزت دار ماننا پڑے گا۔

☆ غریبی اس کے لیے نعمت ہے جس نے اس کی حقیقت کو پا لیا، ورنہ وبالِ جان اور کفر تک لے جانے والی ہے۔

☆ دولت کے فتنے سے بھی وہی بچ سکتا ہے جس نے اس کی حقیقت کو پا لیا۔

☆ حضرت سلیمان علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام جیسی بادشاہت کی تمنا ہم سب کے اندر پنپتی ہے لیکن ہواؤں، پرندوں اور جنات پر حکومت کرنے والے کا چیونٹیوں کے لیے پورے لشکر کا رخ بدلنے کا حوصلہ اور عجز سب کے بس کی بات نہیں۔

ہماری حیثیت

بنت سطور ۔ وادی چھچھ

گھر کے بادشاہ سلامت ابو جان کی نظر میں:

’’ابو! یہ کپ ٹوٹ گیا......!‘‘

’’ضرور تم نے ہی توڑا ہوگا۔ ایسی باتیں ہی سے توقع کی جاسکتی ہیں۔‘‘

ہم نے کپ کا افسوس کیا کیا، جواب میں سخت سست سنیں۔

’’یہ پودے کیسے سوکھ گئے بھئی؟‘‘

ابا جان نے کچھ دن قبل لائے گئے گملوں کے متعلق استفسار کیا۔

’’اُس میں کھاد ڈالی تھی۔‘‘ ہم گویا ہوئے۔

’’کس نے کہا تھا تمھیں کھاد ڈالنے کو؟‘‘ وہ ناراض ہونے لگے۔

’’میں نے کھاد نہیں ڈالی تھی ابو! وہ تو بھیا نے......‘‘

مگر ابو نے کچھ سنا ہی نہیں۔ ’’ایسا بے وقوفی والا کام تم ہی کر سکتی ہو۔ ایسے ننھے ننھے پودے کہاں کھاد کی شدت برداشت کر سکتے ہیں، کچھ عقل کے ناخن لیا کرو۔‘‘

ہم اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

حد ہے بھئی یعنی ان کی نظر میں ہر غلطی ہمیں سے سرزد ہوتی ہے گویا!

گھر کی ملکہ امی جی کی نظر میں:

سالن ختم ہونے کے قریب ہوا تو ہم اٹھ کر اندر کو بھاگنے لگے کہ امی جان کی آواز نے کانوں میں رس گھولا۔

’’پوری اپنی پھپو پر گئی ہو۔ جب سالن ختم ہونے کے قریب ہوتا ہے تو وہ بھی یوں اٹھ کر کہ ’’بھئی میری تو بس ہے‘‘ کہہ کر کمرے میں بند ہو جاتی تھی، اس ڈر سے کہ کہیں اسے سالن نہ لانا پڑے، وہی ڈھنگ ہیں سارے۔‘‘

امی جان نے ہمیں پھپو جان (اللہ انھیں سلامت رکھے) کا حوالہ دے کر طعنہ مارا۔

ہم بھی مگر ڈھیٹ ہڈی ہیں، کھسیانی ہنس ہنس کر چل دیے۔

گھر کے شہزادوں بھائیوں کی نظر میں:

’’بھیا! ذرا لفافہ تو لا دیتے۔‘‘

’’یار ایک تو تم اور تمھارے کاموں سے میں تنگ آ گیا ہوں۔ صبح تمھیں جامعہ چھوڑنے جاؤ، کبھی تمھارے لیے اسٹیشنری کے چکر لگاؤ، کبھی لفافے لاؤ، کبھی خط پوسٹ کراؤ، شام کی چائے تمھارے حلق سے خالی نہیں اترتی، ناشتے میں تمھیں انڈے چاہیے ہوتے ہیں، جان بخشو بھئی میری......!‘‘

میں تپ کر رہ جاتی ہوں، یعنی کوئی عزت ہی نہیں، حد ہے۔

گھر کی شہزادیاں آپیوں کی نظر میں:

’’گڑیا! ذرا بیا کی نیپی چینج کر دو۔‘‘

’’بہنا! ذرا ہانا کو فیڈر بنا دو۔‘‘

’’بیا کو اٹھا لو ذرا۔‘‘

’’دیکھو میرا بیٹا باہر جا رہا ہے، ذرا پکڑو تو اسے۔‘‘

’’میرے منے کو ٹوائلٹ تو لے جاؤ ذرا۔‘‘

جب جب آپیاں چکر لگاتی ہیں تو ہم اسی طرح اُن کے ’’درخواست نما حکم‘‘ پر گھن چکر بنے رہتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ہم سے کچھ ہی چھوٹے گویا ہم عمر بھانجے اور بھانجی جو بس چھے آٹھ سال ہم سے چھوٹے ہیں۔ وہ ہمیں بے شرموں کی طرح ہمارے نِک نیم سے (بغیر کسی اضافی لاحقے خالہ/آنی) پکارتے ہیں۔

تو یہ ہے قارئین! ہماری حیثیت ہمارے گھر والوں کی نظر میں۔ ہماری عزت ہمارے گھر میں اتنی تپلی اس لیے ہے کہ ہم گھر میں اتفاق سے سب سے چھوٹے واقع ہوئے ہیں، لیکن ایک منٹ۔

فسانے یوں تو ’محبت‘ کے سچ ہیں پر کچھ کچھ
بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیبِ داستان کے لیے

جی ہاں! درج بالا باتیں اپنی جگہ مگر ہم سے محبت بھی تو سب بہت کرتے ہیں۔ گھر میں کچھ بھی پکے ہماری پسند کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ گھر میں ہمارے ساتھ کوئی بھی پنگا لے، غلطی ہماری ہو تب بھی ڈانٹ اسے ہی پڑتی ہے۔ یونہی تو نہیں ما بدولت گھر بھر کے لاڈلے ہیں، اور یہ اس لیے کہ گھر میں سب سے چھوٹا ہونے کا اعزاز ہمیں حاصل ہے۔ ☆☆☆

اگر

اثر جونپوری

اگر صنفِ نازک کرے آج ہمت
تو امواجِ عریانی رُک جائیں فوراً
اگر مائیں بہنیں ہوں پردے میں مخفی
تو مردوں کی آنکھیں بھی جھک جائیں فوراً

اگر ماؤں بہنوں میں آ جائے تقویٰ
تو اولاد لمحوں میں پا جائے تقویٰ
جو مسدود ہو جرمِ عصیاں سے راہیں
تو تنگی میں رستہ بنا جائے تقویٰ

جو بہنوں میں آئے قناعت پسندی
بنیں صابرہ شاکرہ رب کی بندی
تو پھر بھائیوں کی ہوس سرد پڑ جائے
کریں فکرِ عقبیٰ کی وہ عقلمندی

بقیہ : سوتیلی

امی ان سے بہت ڈرتی تھیں، مجھے بھی سمجھاتی تھیں کہ جب بابا گھر پر ہوں تو خیال سے رہا کرو۔ ایک دن میں پڑھ رہی تھی، پتا نہیں کس بات پر بابا امی پر چلانے لگے اور پھر مار پیٹ پر اتر آئے۔ امی کی چیخیں سن کر میں بھاگتی ہوئی کمرے میں چلی گئی تو انھوں نے مجھے بالوں سے کھینچتے ہوئے کمرے سے نکالا۔

امی اپنی تکلیف بھول کر مجھے بچانے کو آئیں تو انھیں اتنی زور سے دھکا دیا کہ دیوار سے ٹکرا کر ان کا سر پھٹ گیا۔

میں اپنی قسمت پر رونے لگی کہ وہاں سوتیلی امی کے آگے سگا باپ، باپ نہ بن سکا۔ اپنی بیٹی کو اس کا حق پیار نہ دے سکا اور یہاں سوتیلے باپ کے آگے سگی ماں بے بس و مجبور تھی۔

ایک دن میں نے امی سے پوچھا:

''آپ مجھے چھوڑ کر یہاں کیوں آ گئی تھیں؟ کیا اِن کے لیے؟'' میرا اشارہ ان کے شوہر کی طرف تھا۔

انھوں نے روتے ہوئے مجھے خود سے لپٹا لیا اور بولیں: ''بیٹا! میرے سسرال والوں نے میرا گھر بسنے نہ دیا۔ تمھارے ابو کی جاب وغیرہ اچھی تھی۔ گھر میں سب کا سب سے زیادہ خیال وہی کرتے تھے، شاید گھر والوں کو لگا کہ اپنے بیوی بچوں میں لگ کر یہ ہم کو دینا نہ چھوڑ دے یا مجھے نہیں پتا کیا ان لوگوں کے دل میں کیا تھا، مگر انھوں نے اتنا تمھارے ابو کا دل میری طرف سے خراب کیا، جھوٹی جھوٹی باتیں لگا کر کہ ان کا دل بھی مجھ سے خراب ہو گیا، اور ایک دن مجھ پر بہتان لگا کر مجھے گھر سے نکال دیا۔ تم اس وقت پیدا نہیں ہوئی تھیں۔

پورے خاندان نے کوشش کی۔ تمھارے نانی، نانا سب نے کوشش کی کہ بات بن جائے، مگر وہ لوگ کسی طرح نہیں مانے۔ ایسے ایسے الزامات لگائے کہ میرا جینا دوبھر ہو گیا۔ نانی کے گھر آ کر پتا چلا کہ تم آنے والی ہو تو ایک بار پھر سب نے کوشش کی کہ آؤ مل بیٹھو جو شکوے شکایتیں ہیں بتاؤ، مگر کسی کو رحم نہیں آیا۔ ان لوگوں کی ایک ہی رٹ تھی کہ خلع لے لو۔ تمھارے ماموں نانا نے کہا کہ گھر سے تم لوگوں نے نکالا ہے، دوبارہ رکھنے کے لیے تم لوگ راضی نہیں تو تم لوگ طلاق دو، تب ان کی ذہنیت کا پتا چلا کہ طلاق دینے پر انھیں مہر کی کثیر رقم دینا پڑتی۔ تمام جہیز، زیور سب دینا پڑتا اور خلع پر وہ سب نہیں دینا پڑتا، پھر تم پیدا ہوئی تو پھر ان کی شیطانی طبیعت نے جوش مارا اور تمھیں مجھ سے چھیننے کے لیے ہم پر یعنی مجھ پر جھوٹے کیس ڈالے کہ میں گھر سے ان کا قیمتی زیور چیزیں پیسہ لے کر بھاگی ہوں۔ وہ لوگ بہت اثر رسوخ والے تھے۔ آئے دن دھمکیاں دیتے۔ کبھی نانا کی گاڑی کو کوئی ٹرک والا ٹکر مار دیتا، کبھی بائیک پر تمھارے ماموں کو کوئی گاڑی مار دیتی۔ ہم سب کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کیا جائے۔''

''تو انھوں نے مجھے کیوں آپ سے چھیننا چاہا......؟''

بیٹا گندے لوگ تھے میرے لیے غلط باتیں مشہور کی تھیں کہ میں بدکردار ہوں، بھاگی ہوں تو دنیا والے ان سے سوال کر رہے تھے کہ اپنی اولاد کو اس عورت کے پاس کیوں چھوڑا ہے، جب وہ بے غیرت کسی دوسرے مرد کے چکر میں بھاگی ہے تو۔ سو اپنی جھوٹی شان اور انا کے لیے، اپنے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے مقدمے رشوت کھلا کر اپنے حق میں فیصلے کروالیے۔ اس وقت تمھارے ماموں وغیرہ بھی اتنے بڑے نہیں تھے پھر سب نے مجھے دلاسا دیا سمجھایا کہ ہم لوگ تمھارے ابو کے گھر والوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے، چھوڑ دو سب، اپنی اور اپنے گھر والوں کی زندگی بچاؤ، پھر میں نے بھی سوچا کہ تم کو شاید میں وہ عیش عشرت نہیں دے پاؤں گی جو تمھیں تمھارے ابو کے گھر ملے گا۔ تقریباً دو سال یہ سب چلتا رہا، آخر میں نے ہار مان لی۔ کورٹ میں سب چیزیں معاف کر کے تمھیں بھی دے کر گویا سب کچھ لٹا کر خالی ہاتھ گھر آ گئی۔

امی ہچکیوں سے روتے روتے بتا رہی تھیں۔

میں تڑپ کر ان کے گلے لگ گئی۔ ہم ماں بیٹی دیر تک روتے رہے۔

''امی! آپ بابا کو چھوڑتی کیوں نہیں؟ اتنا ظلم کرتے ہیں وہ آپ پر؟''

''بس بیٹا! اب کچھ سہنے کی تاب نہیں، اب تو عمر گزر ہی گئی، جو تھوڑی بہت ہے، وہ بھی گزر جائے گی۔ طلاق یافتہ عورت عزت سے نہیں دیکھی جاتی اور میرے ساتھ تو پہلے ہی ایک دھبہ لگا ہے۔ اس بار تو سب کو یقین ہو جائے گا کہ میں ہی غلط ہوں۔''

میں سوچنے لگی کہ میری معصوم پاکیزہ ماں پر الزامات لگانے سے پہلے ان لوگوں کا ضمیر ملامت کیوں نہیں کیا۔

میری امی بہت خوبصورت ہیں۔ سب کہتے ہیں میں اپنی ماں پر ہوں۔ یہاں آ کر امی کا پیار پا کر میری صحت بہتر ہوئی تو میں اور بھی اچھی نظر آنے لگی۔ خاندان سے کئی رشتے آنے لگے۔

ایک دفعہ مجھے دیکھنے کچھ لوگ آئے ہوئے تھے۔

پاکیزہ جماعت

صحابہ کی جماعت آپ ﷺ کے تیار کیے ہوئے افراد کا ایک شاہکار ہے۔ پوری کائنات میں پیغمبر کو چھوڑ کر اس سے زیادہ حسین وجمیل، اس سے زیادہ دل کش اور دل آویز تصویر نہیں ملتی جو اُن کی زندگیوں میں نظر آتی ہے۔ اُن کا پختہ یقین، ان کا سچا دل، ان کی بے تکلف زندگی، ان کی بے نفسی وخدا ترسی، ان کی پاکبازی و پاکیزگی، ان کی شفقت ورقت، ان کا ذوقِ عبادت اور ان کا شوقِ شہادت، ان کی شہ سواری اور ان کی شب زندہ داری، ان کی دنیا سے بے رغبتی، ان کا عدل اور حسنِ انتظام، دنیا کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ نبوت کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے جو انسانی افراد تیار کیے، ان میں ایک ایک فرد ایسا تھا جو اگر تاریخ شہادت پیش نہ کرتی اور دنیا اس کی تصدیق نہ کرتی تو ایک شاعرانہ تخیل اور ایک فرضی افسانہ معلوم ہوتا، لیکن وہ تاریخ کی ایک حقیقت ہے۔

اس کے زمانے عجیب اس کے فسانے غریب
عہدِ کہن کو دیا اس نے پیامِ رحیل

(مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ)

امی نے بابا کو بھی بتایا ہوا تھا۔ پتا نہیں کس بات پر بابا نے ان لوگوں کے سامنے ہی امی کو چپل کھینچ کر ماری۔

وہ لوگ تو بے چارے شرمندہ سے ہو کر فوراً ہی اٹھ کر چلے گئے اور رشتے سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد بھی جب کوئی مجھے دیکھنے آتا، بابا کسی نہ کسی بات پر امی کو ایسی ایسی گالیاں سناتے کہ آنے والے فوراً ہی بھاگ جاتے۔

مجھے محسوس ہوا کہ میرے بابا کے مزاج کے خیال سے امی نے اپنے سب رشتے داروں سے بہت کم کم ملنا جلنا رکھا تھا اور وہ لوگ امی کی زندگی کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتے تھے یا یوں کہیں کہ صحیح طرح نہیں جانتے تھے۔ ایک دفعہ اچانک میری نانی ماموں کے ساتھ مجھ سے ملنے آئیں۔

اتفاق سے اسی وقت بابا نے امی کو پانی گرم کرنے کو کہا۔ امی نے گرم پانی بالٹی میں ڈالا اور دیگچی کچن میں رکھنے چلی گئیں۔ بابا پتا نہیں کس دھن میں تھے کہ انھوں نے دیکھا ہی نہیں کہ پانی سے دھواں نکل رہا ہے، وہی کھولتا پانی بدن پر ڈال لیا، حالانکہ بہت ہی تھوڑا پانی گرا ہو گا مگر انھوں نے وہ چیخ پکار مچائی کہ الامان۔ غسل خانے سے باہر نکل کر امی کو بالوں سے پکڑ کر غسل خانے لے جانے لگے کہ تیرے اوپر یہ پانی پھینکوں گا۔ اسی چیخ پکار میں دروازہ بجا تو میں نے دروازہ کھول دیا۔

امی کی چیخیں سن کر ماموں غسل خانے کی طرف بھاگے، جہاں بابا امی پر گرم پانی ڈال رہے تھے۔ ماموں جوان اور صحت مند تھے، انھوں نے دو تین مکے بہنوئی کو رسید کیے۔ خوب جھگڑا ہوا مگر اسی وقت ماموں مجھے اور امی کو اپنے ساتھ لے آئے۔

پھر میرے ذریعے سب ننھیال والوں کو امی کے حالات پتا چلے تو وہ لوگ دنگ رہ گئے۔

پھر سب امی کو سمجھانے بجھانے لگے کہ خلع لے لیتے ہیں۔

امی نہیں مان رہی تھیں کہ میری بیٹی کی زندگی پر میری دو شادی دو طلاق کا اثر پڑے گا، مگر ماموں نے انھیں سمجھایا کہ ایسے جنگلی، بے غیرت مرد کے ساتھ رہ کر جسے تمھاری عزت ہی کی نہیں جان کی بھی پروا نہ ہو، اس کے ساتھ رہ کر اس سے زیادہ برا اثر پڑے گا۔ انھوں نے اب تک میرے آنے والے رشتوں کی مثالیں دیں، جن کی بابت میں نے نانی اماں کو بتا دیا تھا۔

بہر حال کسی طرح امی کی جان اس جلاد سے چھڑا دی گئی، اور آج الحمدللہ میں اپنی صابر شاکر امی کے ساتھ سکون کی زندگی جی رہی ہوں۔

شادی ہونا، پھر بچوں کے ہونے کے بعد ایک مضبوط رشتے میں بندھ جانا یعنی پہلے میاں بیوی کا رشتہ ہوتا ہے، مگر جب آپ بچوں کے ماں باپ بن جاتے ہیں تب یہ زندگی اور اس کے فیصلے کرتے وقت بچوں کا ضرور سوچیے اور مل کر سوچیے۔ ایک میری کیا ہزاروں بچوں کی کہانی میں 'سوتیلی امی' اور 'سوتیلے بابا' ہوتے ہوں گے۔ کتنی زندگیاں درگور ہوتی ہیں، کتنے لوگ ذہنی مریض بنتے اور کتنے جان سے جاتے ہیں؟

وہ میرا منہ بولا بھائی جس کی شرافت، نیکی، ذہانت کا پورا اسکول گواہی دیتا تھا، وہ رشتوں میں گھلے زہر کی وجہ سے ہی ایک ڈاکو بن کر پولیس کے ہاتھوں مارا گیا۔ وہ تو وقت اور قسمت نے مجھے برباد ہونے اور پاگل ہونے سے بچا لیا، ورنہ کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔

امی کہتی ہیں کہ تم میری زندگی میں نہ آئی ہوتیں تو میں اس جلاد کے ہاتھوں مر جاتی اور کسی کو خبر بھی نہ ہوتی۔ امی کو ہم نے سمجھایا کہ جو رشتے جان کا روگ بن جائیں، جس رشتے میں دل میں عزت ہی نہ ہو اور کوئی جواز ساتھ رہنے کا اور نبھانے کا نہ ہو تو ایسے رشتے کو غلطی اور بھول سمجھ کر سدھارا جاتا ہے۔

نانا کے گھر آ کر میں نے اپنی پڑھائی پر توجہ دی اور ڈگری حاصل کی۔ انہی دنوں میرا رشتہ آیا اور سب کی رضا سے میں اس رشتے میں بندھ گئی۔ میرے دل و دماغ میں ایک خوف سا تھا۔ امی کی زندگی میرے لیے ایک بھیانک حقیقت تھی، مگر شاید میرے رب نے میری آزمائش ختم کر دی تھی۔

جی ہاں! میرے شوہر بہت اچھے انسان ہیں۔ محنت کرنے والے، میرے ہر دکھ تکلیف کا احساس کرنے والے۔ امی کو بھی ہم زبردستی اپنے گھر لے آئے۔ مجھ سے زیادہ میرے شوہر میری امی کا خیال رکھتے ہیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میری وہ کہانی جو شروع ہی سے دکھ تکلیف میں بسر ہوئی تھی، اس کا انجام اتنا اچھا اور خوب صورت ہو گا۔

میری نانی، نانا مجھے اور میری امی کو خوش دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ برسوں بعد ان کی بیٹی اب مسکراتی بھی ہے اور ہنستی خوش ہوتی ہے۔

اللہ میاں میری امی جان کو ہمیشہ خوش رکھیں۔ بہت تکالیف اور آزمائش کی بھٹی میں جلنے کے بعد اللہ نے ان کے دامن میں خوشیاں بھری ہیں۔ اب اللہ انھیں دونوں جہاں میں خوش رکھے، آمین!

(یہ ایک سچی کہانی ہے، ،صرف کرداروں کے نام تبدیل کیے گئے ہیں!) ☆☆☆

اقوالِ زریں

☆......پنجرے میں پیدا ہونے والے پرندوں کو لگتا ہے کہ اُڑنا ایک بیماری ہے۔

☆......لوگ اپنی ضروریات پر غور کرتے ہیں، قابلیت پر نہیں۔

☆......زیادہ گفتگو سوچ و فکر کو مردہ کر دیتی ہے۔

☆......جب تم ہمت ہارنے لگو تو سوچنا کہ تم نے اس راہ میں پہلا قدم کس وجہ سے رکھا تھا؟

☆......اگر تم ہارنے سے نہیں ڈرتے تو تمھیں کوئی نہیں ہرا سکتا۔

☆......برائی کو خود میں اور اچھائی کو دوسروں میں تلاش کرو۔

☆......ہر مشکل انسان کی ہمت کا امتحان لیتی ہے۔

☆......روشنی کی امید ضرور رکھو، مگر امیدوں پر زندگی مت گزارو۔

☆......جس کے پاس برداشت کی قوت ہے، وہ کبھی ہار نہیں سکتا۔

☆......پرندہ جب اڑنے کی ٹھان لے تو ہوا کو راستہ دینا ہی پڑتا ہے۔

(انتخاب: فاطمہ بنت مولانا عبدالمناف ضلع نوشہرہ)

حضرت فاطمہ ؓ کے لختِ جگر وضو کر رہے تھے۔ ساتھ میں غلام بھی تھا۔ کھانے کی کوئی چیز زمین پر گری ہوئی تھی۔ غلام نے دیکھا تو وہ چیز اٹھائی اور صاف کر کے کھالی۔ انھوں نے غلام کو یہ کہہ کر آزاد کر دیا کہ گری ہوئی چیز کو اٹھا کر عزت و احترام سے جو کھائے گا، اللہ اسے جہنم سے آزاد کر دے گا۔ جسے اللہ آزاد کر دے، اسے میں کیسے غلام بنا سکتا ہوں۔

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ گھر میں داخل ہوئے تو روٹی کا ٹکڑا زمین پر گرا ہوا نظر آیا، جو یقینا انجانے میں گرا ہوگا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

''اے عائشہ! عزت والی چیز کی عزت کرو۔''

کھاؤ پیو مگر اسراف سے بچو!

بنت سید مقصود الحسن۔ کراچی

اللہ کا دیا ہوا رزق بہت ہی احترام کے لائق ہے۔ اس کی ناقدری ناشکری ہمیں زیب نہیں دیتی کہ ہم اس کے محتاج ہیں، یہ نہ ملے تو ہمارا کیا حال ہو؟

ایک بہت بڑے دینی ادارے میں میرا بیٹا رمضان کا آخری عشرہ اعتکاف میں گزارتا تھا۔ اب چند برسوں سے جانا نہیں ہوتا۔ اس نے دیکھا کہ وہاں افطار میں جو شربت بچ جاتا اسے ایک طالب علم فلش میں بہا دیتا کہ اب کون پیے گا۔ یہ وہ شربت ہوتا جو صرف روح افزا اور پانی سے بنایا جاتا۔ رزق کا اس بے دردی اور بے ادبی کے ساتھ فلش میں بہانا اور وہ بھی مدرسہ کے منتظمین طلبہ کے ہاتھوں، میرا دل لرز گیا۔ ایک طرف وہ غریب آبادی ہے جو روٹی کے لیے ترستے ہیں۔ ان کے گھروں میں آٹا، گھی، چینی بھی میسر نہیں ہوتا۔ دوسری طرف دینی اداروں میں رزق کے زیاں کی ایسی ایسی داستانیں سنیں کہ اللہ کی پناہ۔

میں یہ تحریر قطعاً تنقید برائے تنقید کے لیے نہیں لکھ رہی، میرے اپنے بچے اور گھرانا مدارس دینیہ سے جڑا ہوا ہے۔ مدارس ہماری پناہ گاہیں اور اکابر ہمارے سر کے تاج ہیں، مگر اپنے گریبان کی صفائی بھی ہمیں ہی کرنی ہے۔ کچھ غلط نظر آتا ہو تو عقیدت کے پردوں میں چھپانا نہیں بلکہ اپنی غلطی کو خود آگے بڑھ کر سدھارنا چاہیے۔ اس لیے مدارس میں مفتیانِ کرام، علماء و مشائخ طلبہ سے بہت تاکید سے کہتی ہوں کہ عاجزی سے کھاؤ پیو، رزق ضائع نہ کرو۔

خصوصاً رمضان میں اکثر گھروں میں رزق کی فراوانی ہوتی ہے۔ مساجد و مدارس میں بھی رزق کی وسعت رہتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ بار بار یاد دہانی کرائی جائے کہ رزق کا ایک ٹکڑا بھی ضائع نہ ہو۔ بے حساب افطاری کا انتظام پھر آدھا کھانا آدھا ضائع کرنا اللہ کی ناراضی کا سبب بن سکتا ہے۔ جو افطاری بچ جائے، اسے بعد نماز مغرب کھا کر ختم کرنا چاہیے۔ انہی نعمتوں سے اچھی طرح پیٹ بھر جائے گا تو مزید کھانے کی گنجائش ہی نہیں ہوگی۔

اگر مرغن کھانے کھانے ہی ہیں تو پھر افطاری کم بنانا چاہیے۔

کچھ تو نفس کو مجاہدے کی عادت ڈلوائی جائے، جب تک ہمارے بڑے تربیت نہیں کریں گے اصلاح کیسے ہوگی۔ کبھی محبوب رب العالمین ﷺ کے سحر و افطار کا بھی تصور کر لینا چاہیے۔ شاید ہم اپنے دسترخوانوں کو سمیٹ کر اپنے اوقات کو کچھ بچا کر رکھ سکیں۔

رسول اللہ ﷺ چند کھجور اور پانی سے روزہ افطار کرتے اور اس پر اتنا شکر کرتے کہ انواع و اقسام کی افطاریوں پر بھی لوگوں کو یہ مقام شکر نصیب نہیں ہو سکتا۔ آپ ﷺ کے اصحاب نے بھی اسی طرح چند کھجوروں اور پانی سے روزہ کھولا اور اللہ کی حمد بیان کی اور جو اللہ نے عنایت فرمایا، بقدر ضرورت کھالیا۔ نہ اس میں اسراف ہوتا نہ ناک تک پیٹ بھرنا ہوتا۔

''حضرت عائشہ صدیقہ ؓ فرماتی ہیں، جس کا مفہوم ہے کہ تمام اہلِ مدینہ کی دعوت کی جائے تب بھی میں اپنے محبوب کی پلیٹ پہچان لوں گی۔''

پلیٹوں کو ایسے چمکاؤ جیسی نبی کریم ﷺ کی سنت ہے۔

کئی مدارس میں میرے بیٹے کو پڑھنے کا موقع ملا۔ ایک بڑے مدرسے میں غیر ملکی طلبہ کے لیے اسپیشل کھانا ہوتا تھا۔ وہ بھی پیسے دے کر اس سہولت سے فائدہ اٹھاتا تھا۔

وہاں ناشتے میں حلوہ، پراٹھا، ڈبل روٹی، جیلی، مکھن، کھانے کے ساتھ موسم کے پھل وغیرہ بھی ہوتے۔ دوپہر اور رات کا کھانا بھی اچھا ہوتا۔ کچھ طلبا پلیٹ بھر کر حلوہ نکالتے تھوڑا کھا کر پلیٹ میں بچا دیتے۔ اسی طرح ڈبل روٹی کے کنارے، کبھی ڈبل روٹی کے ٹکڑے بچا دیتے، پراٹھا آدھا کھا کر آدھا بچا دیتے۔ اسی طرح دوپہر اور رات کے کھانے میں بھی بہت کھانا ضائع ہوتا۔

میرا بیٹا بتانے لگا کہ میں اپنے ساتھ بیٹھے طالب علم سے کہتا کہ آپ نے کھالیا ہے تو یہ بچا ہوا حلوہ یا پراٹھا میں لے لوں؟

کہا جاتا کھانے کی کمی نہیں ہے۔ ادھر جہاں کھانا ڈشوں میں رکھا ہے، وہاں سے لے لیں۔ یعنی وہ کھانا ضائع ہو جائے، مگر ساتھ والے کو دینا پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ سوچ ہی نہیں تھی کہ اگلا کس مقصد کے تحت آپ کی پلیٹ سے لے کر کھانا چاہ رہا ہے؟

بقول بیٹے کے اتنا عمدہ مزیدار حلوہ ہوتا تھا کہ دل دُکھتا تھا ان نعمتوں کے ضیاع پر۔

ایک بزرگ دسترخوان سے بچا ہوا سموسے کا ٹکڑا جو عموماً ضائع ہو جاتا ہے، اٹھا کر کھانے لگے۔ لوگوں نے کہا: حضرت! یہ دوسرا لے لیجیے، بہت ہے۔ انھوں نے فرمایا، اس کی بات ہی اور ہے۔ یعنی دسترخوان پر گرا ہوا یا پلیٹ میں بچا ہوا جو ضائع کر دیا جائے گا، اس رزق کو شکرانے کے طور پر کھانا اللہ کو خوش کرتا ہے۔ اس کی بہت فضیلت ہے۔

آخر میں ایک بات اور عرض کرتی چلوں کہ مسجدوں میں ختم قرآن کے موقع پر جو مٹھائی بانٹنے کا اہتمام بڑی پابندی سے کیا جانے لگا ہے، لگتا ہے اس کے بغیر ہماری تراویح قبول نہیں ہوگی۔ یہ بھی فضول رسم کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ کئی لاکھ کی مٹھائیاں تقسیم ہوتی ہیں۔ یہ بھی اسراف بے جا ہے، محض دکھاوا اور نمود و نمائش۔ یہی رقم غریبوں کی جائز ضرورتوں پر خرچ کی جائے تو کتنوں کا بھلا ہو۔ غربت بے روزگاری، کرائے کا مکان، ذرا غریبوں کا درد محسوس کر کے تو دیکھیں۔ پھر یہ سب کہاں اچھا لگے گا۔

☆☆☆

ترقی معکوس

پہلے ماں کی نظریں بتادیتی تھیں کہ ہم کوئی غلطی کر رہے ہیں، سزا ملے گی۔ یہ تنبیہی نگاہیں دیکھ کر ہم لرز جاتے تھے، لیکن پھر ہم نے ''ترقی'' کر لی اور ماں مام (Mom) بن گئیں، اور اتنی ''موم'' کہ اچھے برے کا فرق بتانے کے لیے سختی کرنا ہی بھول گئیں۔

پہلے شام ہوتے ہی ابو کے آنے کا انتظار ہوتا تھا، پھر ہم نے ترقی کر لی اور ابو ڈیڈ (Dad) بن گئے اور جنریشن گیپ کے نام پہ یہ رشتہ ہی ڈیڈ (Dead یعنی مردہ) ہوگیا۔

پہلے پھپو کے آنے پر بہترین بستر اور بہترین برتن نکالے جاتے تھے۔ بتایا جاتا تھا یہ تمھارے ابو کی بہن ہیں تو یہ گھر ان کا بھی ہے، پھر ہم نے ترقی کر لی اور پتہ چلا پھپو تو فساد کی جڑ اور فتنہ ہوتا ہے۔

پہلے تعلیم حاصل کی جاتی تھی جو عموماً نظر آتی تھی، پھر ہم نے ترقی کر لی اور ڈگریاں لینے لگے مگر تعلیم کہیں گم ہوگئی۔

پہلے محلہ داری ہوتی تھی۔ ایک دوسرے کے گھر آنا جانا، رشتے داروں سے زیادہ ایک دوسرے کے دکھ درد اور خوشیوں کو بانٹنا، روز اپنی حیثیت کے مطابق کھانا پھل ایک دوسرے کو بھجوانا، پھر ہم نے ترقی کر لی اور ایک گھر میں قورمہ تو دوسرے گھر میں بھوک سے خودکشی کی جانے لگی۔

پہلے عید اور دیگر تہوار ماں باپ اور خاندان کے ساتھ گزرتے تھے، پھر ہم نے ترقی کر لی اور عید تہوار سہیلیوں کے ساتھ بازاروں میں گزارنے لگے۔

پہلے شادی بیاہ کے معاملات خاندان کے بڑے طے کرتے تھے، پھر ہم نے ترقی کر لی اور پسند کی شادی کے لیے بچے گھر سے بھاگنے لگے۔

پہلے شادی شدہ بیٹی کو صبر اور خدمت کی تلقین کی جاتی تھی، پھر ہم نے ترقی کر لی اور اب صرف برانڈڈ سوٹ اور اسمارٹ فون افورڈ نہ کرنے والے شوہر سے اس بات پر علیحدگی بھی ہوسکتی ہے۔

پہلے میاں بیوی کا جھگڑا ہوتا تو رات شوہر کی واپسی پر جھگڑا ختم ہو چکا ہوتا، پھر ہم نے ''ترقی'' کر لی اور چھوٹے چھوٹے جھگڑوں کی خبریں واٹس ایپ گروپوں میں شیئر ہونے لگی اور جھگڑے طول پکڑتے گئے۔

پہلے شادی سے پہلے منگیتر سے بات کرنا تو الگ دیکھنا بھی حرام تھا، پھر ہم نے ترقی کر لی اور شادی سے پہلے ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے ساتھ گھوما پھرا جانے لگا۔

پہلے گھر خاندان میں نامحرموں سے پردہ کرنا سکھایا جاتا تھا، مگر پھر ہم نے ترقی کر لی اور سب کزنز ''بھائی'' ہوگے۔

پہلے پردے کے لیے چادریں اور برقعے ہوتے تھے، پھر ہم نے ترقی کر لی اور پردہ سمٹ کر بس نگاہ میں بلکہ دل میں آ گیا۔

پہلے بزرگ گھر کی رونق ہوتے تھے، پھر ہم نے ''ترقی'' کر لی اور ان کا وجود، ان کا بولنا بوجھ بن گیا......!!!

انتخاب: رافعہ عبدالغفار ۔ سکھر

کفارہ

آصف مجید

''دس مسکینوں کا کھانا کتنے کا آئے گا......؟''

بیگم نے کتاب پر نظر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''اگر ایک بندے کا کھانا سو روپے کا ہو تو ہزار روپے بنتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''یا ایک ہی مسکین کو ہزار روپے دے دیے جائیں۔'' انھوں نے پوچھا۔

''بالکل ٹھیک ہے، لیکن آپ نے کون سی قسم توڑی ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''جونیجو کے دورِ حکومت میں فارم بھرا تھا۔''

بیگم نے مختصر جواب دیا۔

''آپ ایسا کریں، مجھے ہزار روپے دے دیں، میں مسکین ہوں۔''

''ہوں......! آپ کیسے مسکین ہوگئے؟''

''عرب لوگ کہتے ہیں کہ جس کی ایک بیگم ہو، وہ مسکین ہوتا ہے، میری ایک بیگم ہے اس لیے ثابت ہوا کہ میں مسکین ہوں۔''

''ہاہاہا......'' بیگم نے زوردار قہقہہ لگایا۔ یہ قہقہہ پکا ثبوت تھا ''ہم کہ ٹھہرے مسکین''

''لیکن یہ تو بتائیں کہ قسم ٹوٹی کیسے تھی؟''

''جونیجو کے دور میں ایف اے کے امتحانات کا داخلہ فارم بھرا تھا۔ اس میں حلفیہ بیان دیا تھا کہ ہم نے ایک ناخواندہ کو پڑھایا ہے۔''

''ہوں...... یہ تو جھوٹی قسم ہے......اور جھوٹی قسم کا کفارہ نہیں ہوتا بلکہ توبہ استغفار ہی کرنا پڑتا ہے، لیکن پھر بھی آپ احتیاطاً ایک ہزار روپے اس مسکین کو دے دیں۔ آج ویسے بھی پندرہ شعبان ہے، ثواب بھی زیادہ ہوگا یا ایسا کریں، دس دن تک مسلسل کھانا کھلا دیں۔ کل شوارما کھلایا تھا، اسے بھی شامل کرلیں۔ آج چکن تکہ، کل ڈونر، پرسوں سیخ کباب، اس کے بعد بریانی......!''

بریانی تو آپ کو پسند ہی نہیں ہے۔''

بیگم نے نقطہ اعتراض اٹھایا۔

بقیہ : سہارا

صالحہ بیگم کی صحت کے بارے میں معالج بھی بالکل مایوس تھے۔ علاج و معالجہ، جو ہو رہا تھا، اس کا مقصد صرف اتنا تھا کہ وہ جسمانی درد و تکلیف سے زیادہ سے زیادہ محفوظ رہیں۔ باقی اُن کی صحت پانے کا اب کوئی امکان نہ تھا۔

ان کی تیمارداری اور دیکھ بھال اتنا لمبا کام تھا کہ منیرہ کو اتنی فرصت بھی نہ ملتی تھی کہ وہ بیٹھ کر سوچے کہ اِس پر کیا بیت گئی۔

چند منٹوں کے لیے جب کبھی صالحہ بیگم سوئی ہوئی ہوتیں اور کوئی کام بھی نہ ہوتا تو منیرہ ماجد کا وہ خط کھول کر بیٹھ جاتی اور رو رو کر اپنا برا حال کر لیتی۔

روتے روتے معاً اس کے دل میں کچھ آجاتا اور وہ یک دم چپ ہو جاتی۔

”کیا میں مصائب کے آگے ہار مان رہی ہوں؟“

”نہیں نہیں میرے مالک! میں ہار نہیں مان رہی۔ میں ہرگز ہار نہیں مانوں گی۔ میں تو تیری رضا سے راضی ہوں......تُو ضرور میرے دن پھیرے گا۔“ پھر وہ خط الماری میں رکھ دیتی اور اٹھ کر کسی کام میں مصروف ہو جاتی۔

☆......☆

گھر کھچا کھچ عورتوں اور بچوں سے بھرا ہوا تھا۔ اندر باہر عورتیں ہی عورتیں نظر آرہی تھیں۔ صالحہ بیگم نے زندگی میں ہمسایوں، رشتے داروں، ملنے ملانے والوں، غریبوں، محتاجوں غرضیکہ ہر حیثیت اور ہر طبقے کے لوگوں سے ایسا نیک سلوک کیا تھا کہ اب کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اشک بار نہ ہو اور کوئی دل نہ تھا جو غم و الم میں ڈوبا ہوا نہ ہو۔ بڑے بڑے امیر رشتے داروں اور سمدھیانوں سے لے کر، صادق قصاب کی غریب بیوہ تک کی زبان پر ایک ہی جملہ تھا: ”کیسی جنتی بی بی تھیں۔“

سفید پاکیزہ کفن میں زرد کتابی چہرے پر شرافت کا نور برس رہا تھا۔ وہ ایک مثالی بیوی، ایک شفیق مگر عقل مند ماں اور ایک کامیاب گھر والی تھیں۔ درمیانی درجے کی آمدنی ہی میں وہ اَن گنت محتاجوں کی ضرورتیں اس طرح پوری کرتی رہی تھیں کہ بائیں ہاتھ کو پتا نہ چلتا تھا کہ داہنے نے کیا کیا۔ مالی لحاظ سے اخلاق صاحب کے رشتے دار اور خود صالحہ بیگم کا کنبہ اِس گھر کے مقابلے میں بہت زیادہ امیر تھا، مگر اِن دونوں ہستیوں کے رکھ رکھاؤ، حسنِ سلوک اور عقل مندانہ برتاؤ نے انھیں دونوں کنبوں کا سرتاج بنائے رکھا۔ اشک بار مجمع میں بے شمار غریب عورتیں ایسی تھیں جو صالحہ بیگم کو نہیں، اپنی ضروریات اور احتیاجات کو رو رہی تھیں۔

زندگی میں دکھ بھی آئے اور سکھ بھی، دقتیں بھی آئیں اور آسانیاں بھی، خوش حالیاں بھی دیکھیں اور تنگ دستی بھی، بیٹوں کے سہرے دیکھنے کا ارمان بھی پورا کیا اور شوہر کے ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے کا چرکا بھی سہا، مگر جو صورت حال بھی پیدا ہوئی، اس نے اس مومنہ عورت کو آن بان والی ہی پایا۔ نہ خوشیوں نے اسے متکبر بنایا نہ غموں نے اسے یاس کا شکار کیا۔ (جاری ہے)

”اوہو......بھئی! وہ تو ٹھیک ہے مگر دس کھانے بھی تو پورے کرنے ہیں......اور......“

”اور آپ نے بھی تو جونیجو کے دورِ حکومت میں فارم بھرے ہوں گے؟ آپ کیوں گول کر رہے ہیں جناب!“

بیگم نے جوابی وار کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ فاؤل تھا...... اور خود ہی ان کو اندازہ ہو گیا تھا اپنی غلطی کا۔

”آپ تو اس وقت یونیورسٹی میں پڑھتے ہوں گے...... چار سال کا فرق جو ہے۔“

بیگم نے اپنی بات کا خود ہی جواب دے دیا تھا اور ہم مسکرا کر رہ گئے تھے۔

ابھی ہم یہ ڈائری لکھ ہی رہے تھے کہ آواز آئی: ”پچاس روپے دینا، بوتل منگوانی ہے۔“

لو جی لینے کے دینے پڑ گئے اور لکھنے کا کام ڈانواڈول ہوا۔ قلم دوسرے ہاتھ میں پکڑا، دایاں ہاتھ جیب میں ڈال کر پچاس روپے نکال کر بیگم کے ہاتھ میں تھمائے، اور ہزار روپے کی 'خوش فہمی' میں مبتلا ہو کر دوبارہ ڈائری لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ ہزار روپے تو آنی جانی شے ہے، رہے نام اللہ کا۔

بنت الاسلام

سہارا

36

ایک مومنہ کی کہانی
اس کا آشیانہ
تنکا تنکا بکھر گیا

نوشابہ کو گھر کے نوکروں کے خلاف بھی بہت شکایات تھیں۔ بڑی بی بہت بوڑھی تھیں اور بقول اس کے کام چور بھی تھیں۔ ان کا پوتا بدتمیز اور آوارہ گرد تھا۔ کپڑے دھونے والی طالعہ بہت زیادہ باتیں کرتی تھی اور کپڑے صاف نہیں دھوتی تھی۔ جمعدارنی کو صفائی کرنا بالکل نہیں آتا تھا اور اس کے علاوہ وہ چور بھی تھی۔ دھوبی کپڑوں کے بٹن توڑ لاتا تھا۔

نوشابہ چاہتی تھی کہ نوکروں کے اس پورے سیٹ اپ کو بدل دے۔ امجد اسے سمجھاتا کہ یہ امی کے پرانے نوکر ہیں، ہم انھیں بدلیں گے تو انھیں بہت صدمہ ہوگا۔ اس پر نوشابہ سخت تنگی محسوس کرتی اور جھلاتی کہ وہ اس گھر میں کیسے رہے جہاں وہ اتنی 'بے بس' ہے کہ مرضی کا نوکر بھی نہیں رکھ سکتی۔

گھر کے حالات اتنے بدل گئے تھے کہ وہ پہلا سا گھر لگتا ہی نہیں تھا۔ اخلاق صاحب کے آنکھیں بند کرتے ہی صالحہ بیگم اور ساتھ ہی اُن کے بچے، ایک دم عرش سے فرش پر آ گرے تھے۔ پھر وہ جس بیماری کا شکار ہوگئی تھیں، اس نے تو انھیں بالکل محتاج کر دیا تھا۔ ان کے جسم کا آدھا حصہ بالکل بے کار ہوگیا تھا۔ انھیں اٹھانے، بٹھانے اور کھانا کھلانے کے لیے بھی اب کسی دوسرے انسان کی ضرورت تھی۔ نوشابہ سے تو یہ توقع ہرگز نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ ایسے کام کرے۔ راضیہ بمشکل گیارہ بارہ برس کی تھی اور زبیدہ ممانی کو بیماری نے نیم بوڑھا کر دیا تھا۔ تیمارداری کا زیادہ تر بوجھ منیرہ ہی کے کندھوں پر آ پڑا تھا۔

منیرہ کے بچے بھی اب مسئلہ بن گئے تھے۔ بچے آخر بچے ہی تھے، وہ حالات کی تبدیلی کو پوری طرح سمجھ نہیں سکتے تھے۔ وہ توقع رکھتے کہ اُن کا پہلا سا لاڈ قائم رہے، مگر اب وہ ناز اٹھانے والے ہی نہیں رہے تھے۔ اخلاق صاحب کی وفات، شائستہ اور ارجمند کے رخصت ہوجانے اور صالحہ بیگم کے بیمار پڑ جانے کے باعث گھر کی ساری خیر و برکت ختم ہوچکی تھی۔ بچے اپنی عادت کے مطابق بھاگتے دوڑتے اور شور مچاتے تو نوشابہ بہت ناراض ہوتی۔

عافی طبعاً شورش پسند اور دبنگ قسم کی بچی تھی۔ ایک دن جب وہ نوشابہ کے منع کرنے کے باوجود غل مچانے سے باز نہ آئی تو نوشابہ ایسی آپے سے باہر ہوئی کہ اس کے کان اینٹھ ڈالے۔

عافی بھلا ایسے سلوک کی کہاں عادی تھی، اُس نے گلا پھاڑ پھاڑ کر رونا شروع کر دیا۔ بڑی بی باورچی خانے میں سے دیکھ رہی تھیں۔ عافی کا کان اینٹھا جانا ان کی برداشت سے باہر تھا، وہ بے تاب ہوکر باہر نکل آئیں اور عافی کو گود میں لیتے ہوئے بولیں:

''دلھن بیگم! کچھ تو خدا کا خوف کریں۔ آخر اس معصوم نے آپ کا کیا بگاڑا تھا جو آپ نے اس کے کان مروڑ دیے۔''

اور وہ شدت غم سے ہچکیاں لے لے کر رونے لگیں۔

نوشابہ کو بھلا اتنی سہار کہاں، اس نے بڑی بی کی وہ وہ فضیحتیں کیں کہ وہ روتے روتے بے حال ہوگئیں۔

منیرہ کے لیے اپنے گھر کی بربادی اور ماجد کا گرفتارِ بلا ہوجانا ہی اتنے بڑے بڑے المیے تھے کہ جن کی برداشت اس کے لیے مشکل تھی، کجا یہ کہ جس گھر میں اس نے ایک قسم کی پناہ لی ہوئی تھی، وہ بھی اب مسائل کی پوٹ بن کر رہ گیا تھا۔ اسے اپنے چاروں طرف بے بسی ہی بے بسی نظر آتی تھی۔ جس ماں کو اس نے ایک ملکہ کی طرح اس گھر میں حکومت کرتے دیکھا تھا، وہ ایک اپاہج کی حیثیت سے چار پائی پر پڑی تھی۔ راضیہ اور طارق کے چہرے ڈرے سہمے سے رہتے تھے کہ مبادا کوئی ایسی بات ہوجائے جس سے بھابی جان ناراض ہوجائیں۔ جاوید اور منا بھی نوشابہ کو دیکھتے ہی سہم جاتے تھے اور عافی کے بھی جس دن سے کان اینٹھے گئے تھے، وہ نوشابہ سے ڈرنے لگی تھی۔

نوشابہ روز بروز تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی کیونکہ اِس طرف سے تو کوئی جواب دینے والا تھا نہیں۔ زبیدہ ممانی اگرچہ زبان کی تیز رہی تھیں مگر اب کچھ بڑھاپے اور کچھ صدموں نے انھیں بھی مدہم کر دیا تھا۔ نوشابہ کو اُن کے ہر وقت اس گھر میں گھسے رہنے پر بھی اعتراض تھا، مگر جب انھوں نے کوشش کی کہ صالحہ بیگم کو اپنے گھر لے جائیں تو نہ تو امجد مانا اور نہ صالحہ بیگم خود اس پر تیار ہوئیں کیونکہ اس میں انھیں اپنی اولاد کی بے عزتی محسوس ہوتی تھی۔ لاچار منیرہ نے یہ عذر پیش کر کے کہ بچے غل مچا کر امی جان کو تنگ کرتے ہیں، یہ بندوبست کیا کہ راضیہ بچوں کو لے کر حاکم بی بی کی نگرانی میں سارا دن زبیدہ ممانی کے گھر رہا کرے اور زبیدہ ممانی صالحہ بیگم کے پاس۔ کیونکہ وہ کسی صورت میں بھی صالحہ بیگم کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی تھیں چاہے نوشابہ کتنی ہی ناک بھوں کیوں نہ چڑھائے۔

بلاؤں کے اس ہجوم میں جس انسان نے منیرہ کا صحیح معنوں میں ساتھ دیا، وہ اصغری خانم تھیں۔ انھوں نے ماجد کا خط آنے سے پہلے ہی منیرہ کو ذہنی طور پر اِس صدمے کے لیے تیار کر دیا تھا۔ اس کے بعد بھی جو جو مرحلے اس پر گزرے، ان میں اصغری خانم نے منیرہ کا پورا پورا ساتھ دیا۔ اپنی مصروفیات کے باوجود وہ ہر تیسرے چوتھے دن اس کے پاس ضرور آتیں اور صالحہ بیگم کی تیمارداری میں ہاتھ بٹانے کے علاوہ اس کے ساتھ غم اور پریشانی کے فلسفے پر کچھ اِس انداز سے بات کرتیں کہ منیرہ کو اپنے تمام دکھ ہلکے محسوس ہونے لگتے۔ (باقی صفحہ 14 پر)